اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

اپریل ۲۰۱۸ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۲۲، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۱۸ء/ رجب المرجب ۱۴۳۹ھ

مشمولات

تعلیم، تحقیق، تربیت، تزکیۂ نفس

Oتعلیم

تعلیم ۔نظریاتی وقومی تقاضے — ڈاکٹر مشتاق الرحمن صدیقی — ۴

Oتحقیق

فکر اسلامی ۔ نئے دائرہ ہائے تحقیق — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۳

Oجدید تعلیم

جدید تعلیمی ادارے اور الحاد — عبدالوہاب سلیم — ۱۵

Oتزکیۂ نفس

آخرت میں کامیابی کا تیر بہدف نسخہ — عبدالمالک — ۲۱

اسلام، پاکستان اور مغرب

Oفہم دین

دانش وجرأت کا فقدان — پروفیسر طارق بٹ — ۲۵

’پیغام پاکستان‘ ۔علماء کا مخدوش موقف — مدیر — ۲۸

Oجدید ریاست

جدیدیت اور جدید ریاست کی ناکامی — سید خالد جامعی — ۳۰

Oلبرل ازم

لبرل ازم، الحاد اور اسلام — حامد کمال الدین — ۴۱

Oعالم اسلام

شام کی ’شامِ غم‘ اور زوال امت — مدیر — ۵۲

Oدریچے

پڑھتا جا شرماتا جا — ’نقیبِ سحر‘ — ۵۵

البرہان آن لائن مطالعہ کیجیے: **www.al-burhan.com**

تعلیم ڈاکٹر مشتاق الرحمن صدیقی[۱]

تعلیم۔ نظریاتی وقومی تقاضے

انسان کی کردار سازی میں متعدد عوامل کردار ادا کرتے ہیں لیکن ان میں سب سے موثر اور سب سے کارگر عمل، تعلیم کا ہے۔ جغرافیائی اور ماحولیاتی عناصر ہر جاندار کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے اسلوب حیات کو مخصوص رخ دیتے ہیں لیکن انسان کا معاملہ عام جانداروں سے بڑا مختلف ہے۔ وہ بہت سی باتیں اپنے گردوپیش پھیلے ماحول سے اخذ کرتا ہے لیکن اسے کاملاً ماحولیاتی عناصر کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا کیونکہ ہر معاشرہ انسان کو ایک خاص سانچے میں ڈھلا دیکھنا چاہتا ہے جو اس معاشرے یا قوم کے متعینہ مقاصد کے حصول میں اپنا موثر کردار ادا کر سکے۔

نظریاتی ممالک کے پیش نظر سب سے اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں مادی مقاصد کی تکمیل کے لیے بھی افرادی قوت تیار کرنا ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں ایسے افراد بھی مطلوب ہوتے ہیں جو اس قوم کے اساسی نظریات اور اخلاقی داعیوں کے علمبردار ہوں۔ گویا نظریے کی حامل اقوام کو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اس نظریے کے تحفظ اور بقا کی جنگ بھی لڑنا ہوتی ہے جو اس قوم کے وجود کی اساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی اقوام کو اپنے تعلیمی نظام پر خصوصی توجہ دینا ہوتی ہے۔ اگر وہ ہنگامی یا فوری مقاصد کی تکمیل کے لیے دوسری اقوام کی دیکھا دیکھی مادہ پرستانہ نظام اپنالیں تو ان کا نظریاتی وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اگر وہ محض نظریے کی آبیاری پر توجہ دیتے ہوئے تیز پا دنیا کے جائز اور اہم تقاضوں کو نظرانداز کردیں تو پسماندگی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ یہ پسماندگی نہ صرف قوموں کے مادی وجود کو خطرے میں ڈال دیتی ہے بلکہ ان کی نظریاتی بقا بھی معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔

ہمارے ہاں مغربی طرز کے تعلیمی ادارے اور قدیم طرز کے اسلامی مدارس اسی تفریق اور ثنویت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایک طرف مادی ماحول کے تقاضوں کی پاسداری کا اہتمام ہے اور دوسری طرف اپنے بنیادی نظریہ حیات یعنی اسلام کے تصور کو محدود کرتے ہوئے ایسی

[۱] سابق ڈائریکٹر ادارہ تعلیم وتحقیق پنجاب یونیورسٹی، لاہور

نصابی قدغنیں لگا دی گئی ہیں جو مدرسے کے نظامِ تعلیم کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں طرح کے نظام ہائے تعلیم کی فیکٹریوں سے نکلنے والے افراد میں کسی طرح کی کوئی ذہنی وفکری ہم آہنگی پیدا نہ ہوسکی بلکہ یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ دونوں کے فکر ونظر میں تضاد پیدا ہوا اور دونوں طبقے ایک دوسرے کے حریف ٹھہرے۔

ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کی تخلیق کے محرکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا متوازن، معتدل اور موثر نظامِ تعلیم اپنائیں جو بیک وقت مادی اور نظریاتی تقاضوں کو پورا کرسکے۔ اس کی ضرورت یوں بھی محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں مروجہ متوازی دھاروں میں سے کوئی دھارا بھی ایسے عظیم افراد پیدا نہیں کرسکا جو اپنے اپنے میدان میں معتبر ٹھہرتے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں نے کوئی ذہین وفطین اور باصلاحیت فرد پیدا نہیں کیا یا اسلامی مدرسوں سے کسی صاحب فکر ونظر نے جنم نہیں لیا۔ اصل بات صرف اس قدر ہے کہ استثنائی صورتوں کو چھوڑ کے ان تعلیمی اداروں نے بالعموم اوسط صلاحیت کے حامل افراد پیدا کیے جنہوں نے کسی شعبۂ حیات میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یوں ہمارا معاشرہ اجتماعی زوال کا شکار ہوتا چلا گیا۔ نہ کوئی معیارِ علم ودانش تشکیل پاسکا اور نہ کوئی معیارِ اخلاق وکردار۔ تقریباً پون صدی کا عرصہ گزرنے کے باوجود آج ہمارا معاشرہ مادی ترقی اور اسلامی معیارِ کردار کے اعتبار سے ایک انتہائی روح فرسا منظر پیش کرتا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم نے اپنا کردار ادا نہیں کیا۔ تقریباً تمام معاشرتی ادارے انحطاط کا شکار ہیں یہاں تک کہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ جسے ہم ''مقننہ'' کہتے ہیں، ایسے عوارض کا شکار ہو چکا ہے جس کے تذکرے سے بھی گھن آتی ہے۔ جب ہم معیارِ اخلاق وکردار کی پستی کا یہ عالم دیکھتے ہیں تو ہمارا یقین اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ مطلوبہ نتائج (چاہے وہ مادی ہی کیوں نہ ہوں) حاصل کرنے کے لیے ہمیں ایسے افراد کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں ضمیر کے چراغ روشن ہوں، جن کی فکر میں کجی نہ ہو اور جو اخلاقی قوت سے آراستہ ہوں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں پہنچ کر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں مکتب کی کرامت کے ساتھ ساتھ فیضانِ نظر کی بھی ضرورت ہے اور یہ فیضانِ نظر پیدا کرنے کے لیے ہمیں اپنے نظامِ تعلیم کو ان خطوط پر استوار کرنا ہوگا جو ہمارے قومی وملی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔

حقیقت میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نظامِ تعلیم کا محوری نصب العین دستورِ پاکستان

میں شامل قرارداد مقاصد کی درج ذیل دفعہ میں طے کیا جا چکا ہے:

’’انسان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ میں متعین ہیں تربیت دے سکیں۔‘‘

اس دفعہ کی موجودگی میں پاکستان میں قائم ہونے والی ہر حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ملک میں ایسا نظام تعلیم قائم کرے جس سے درج بالا نصب العین حاصل ہو۔ لہٰذا اس مقصد کی تکمیل کے لیے تعلیمی نصابات، درسی کتب، تربیت اساتذہ، تعلیمی انتظامیہ، طریق امتحانات، غرض پورے تعلیمی عمل کو اس انداز پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ ابتدائی سے انتہائی مدارج تک، ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلامی نظریۂ حیات پیوست ہو جائے اور طلبہ کی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھل کر نکلیں اور وہ بیک وقت خداترس اور فرض شناس بھی بنیں اور اپنے اپنے علم و فن میں بھی ماہر ہوں۔

اس ضمن میں مختلف ادوار میں کچھ نہ کچھ جزوی تبدیلیاں لائی گئیں لیکن بحیثیت کُل یہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئیں۔ اور اگر کبھی کوئی جامع لائحہ عمل مرتب بھی کیا گیا تو سیکولر محاذ کی طرف سے جلی اور خفی مزاحمت اور کسی حد تک خود دین پسند طبقے کی مناسب حکمت عملی کے فقدان کی وجہ سے اسلامی نظام تعلیم کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ایک موقع پر اس قرارداد مقاصد کے تناظر میں پاکستان کی سینٹ نے شریعت بل متفقہ طور پر منظور کر لیا، جو فی الواقع انتہائی احسن اور مبارک اقدام تھا۔ تعلیمی حوالے سے اس شریعت بل کے تحت مملکت کی یہ ذمہ داری طے کی گئی کہ وہ ایسے موثر اقدام کرے جن کے ذریعے ابلاغ عامہ سے اسلامی اقدار کو فروغ ملے۔ مملکت اسلامی معاشرہ کی حیثیت سے جامع اور متوازن ترقی کے لیے موثر اقدامات کرے گی تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جا سکے کہ پاکستان کے نظام تعلیم و تدریس کی اساس اسلامی اقدار پر ہو۔ صدر مملکت اس قانون کے آغاز نفاذ سے ساٹھ دن کے اندر تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کریں گے جو ماہرین تعلیم، ماہرین ابلاغ عامہ، علماء اور منتخب نمائندگان پارلیمنٹ پر مشتمل ہوگا۔ کمیشن کے کارہائے منصبی یہ ہوں گے۔

i۔ تعلیم کی اسلامی تشکیل اور اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے ذرائع ابلاغ عامہ کا

جائزہ اور اس بارے میں سفارشات مرتب کرنا۔

ii۔ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے عمل کی نگرانی کرنا اور عدم تعمیل کے معاملات وفاقی حکومت کے علم میں لانا۔

iii۔ کمشن کی سفارشات پر مشتمل ایک جامع رپورٹ اس کے تقرر کی تاریخ سے ایک سال کی مدت کے اندر وفاقی حکومت کو پیش کرنا۔

iv۔ اس کے بعد حسب ضرورت وقتاً فوقتاً رپورٹیں تیار کرنا۔

سینٹ سے منظور شدہ شریعت بل کی ان شقوں سے جو بالخصوص تعلیم سے متعلق ہیں اور ان شقوں سے جو بالعموم دیگر انفرادی اور اجتماعی امور زندگی سے متعلق ہیں، رہنمائی لیتے ہوئے قومی اور ملی تقاضوں کے تناظر میں درج ذیل چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ اسلامی حکمت تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق یا ثنویت کا نظریہ صحیح نہیں بلکہ اس کے برعکس وحدت فکر و عمل اور وحدت دین و دنیا کے عالمگیر آفاقی نظریہ کی روشنی میں دینی اور دنیوی مدرسوں کے نصاب اور درسی کتب کو قرآن و حدیث کے آئینے میں اس طرح وضع کیا جائے کہ خالق کائنات اور اس کے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کو نمایاں حیثیت دی جائے اور اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب سے متعلق دشمنان اسلام کے مبینہ الزامات کو دلیل سے مسترد کیا جائے اور نوجوان نسل کے دلوں میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو جاگزین کیا جائے۔

۲۔ اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے عقیدوں، اپنے اصول و مقاصد، اپنے بزرگوں، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنے قانون، دنیا پر پڑنے والے اپنے اثرات اور اب ان اثرات کے دھندلا جانے اور باہر سے مسلمانوں پر پڑنے والے اثرات کا علم رکھتے ہوں اور یہی علم ہم طلبہ میں منتقل کرنے کے لیے نصاب تیار کریں۔

۳۔ فزیکل، نیچرل اور اطلاقی سائنسز کی تشکیل نو اسلامی عقیدہ سے ہو اور طلبہ کے دینی افکار میں وسعت پیدا ہو نیز وہ خالق ارض و سما کی عظمت کا اندازہ کر سکیں۔ موجودہ سائنسی نصاب اور کتابوں کو ان نظریات سے جو اسلامی عقیدہ سے براہ راست متصادم ہوں، یکسر پاک و صاف ہونا چاہیے۔ نیز اس میدان میں یہ تحقیق بھی کی جائے کہ مسلمانوں کے دور عروج میں

سائنس کی ترقی اور بعد میں اس کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟

۴۔ ملی یکجہتی کے لیے ہر سطح کے تعلیمی اداروں میں غیر طبقاتی تعلیم، یکساں نصاب تعلیم، یکساں ذریعہ تعلیم، یکساں طریق تربیت، یکساں طریق امتحان، یکساں تعلیمی معیار، یکساں سہولیات اور یکساں یونیفارم کا انتظام کیا جائے۔ اس طرح تعلیم میں طبقہ واریت اور کئی نظاموں کو ختم کر کے ایک ہی نظام تعلیم رائج کیا جائے۔

۵۔ اسلام میں تعلیم کے حصول کا فرض مردوں اور عورتوں پر یکساں طور پر عائد ہوتا ہے لیکن اس ضمن میں مسلمانوں کی تاریخ میں مخلوط تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اسلامی نظام کی تشکیل میں یہ ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل تجاویز بڑی اہمیت کی حامل ہیں:

i۔ مخلوط تعلیم کا فی الفور خاتمہ کیا جائے۔

ii۔ تعلیمی اداروں میں ایسی حکمت عملی وضع کی جائے کہ بالغ طالبات حصول علم کے لیے پردہ ترک کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

iii۔ خواتین سے متعلق تعلیمی اور انتظامی اداروں کا انتظام خود خواتین کریں۔ اس طرح ان کے روزگار اور ترقی کے مواقع میں بھی اضافہ ہوگا اور اسلامی اقدار کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

۶۔ اسلام کے سارے مآخذ چونکہ عربی زبان میں ہیں اس لیے اسلام کی روح کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ عربی زبان کو کم از کم دسویں جماعت تک بطور لازمی مضمون پڑھایا جائے تاکہ قرآن کی تعلیم جو مسلمانوں کے اعتقادات، اخلاقیات اور تدبر و تفکر کی تشکیل میں بنیادی قدم ہے، حاصل کی جا سکے۔

۷۔ قومی سطح پر انگریزی کی بجائے قومی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ نیز بورڈوں، یونیورسٹیوں اور مقابلے کے تمام تحریری اور زبانی امتحانات قومی زبان اردو میں ہوں اس کے ساتھ ہی علاقائی زبانوں کی ترقی کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

۸۔ ملک کے تمام افراد کو بلا تمیز رنگ و نسل اور زبان و مذہب میٹرک تک مفت لازمی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

۹۔ حصول علم میں غربت کو کسی صورت رکاوٹ نہ بننے دیا جائے۔ غریب گھرانوں کے

ذہین وفطین بچوں کے لیے سرکاری خرچ پر اندرون وبیرون ملک تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۱۰۔ تعلیمی سہولتیں صرف شہری اور قریبی دیہی آبادی تک ہی محدود نہ ہوں بلکہ دور دراز قبائلی علاقوں اور خانہ بدوش قبائل کے لیے بھی مختص کی جائیں۔ان لوگوں کی تعلیم کے لیے سفری سکولوں کا انتظام کیا جائے۔نیز اوپن یونیورسٹی کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

۱۱۔ ملک کی ہر بستی میں لازماً کم از کم ایک پرائمری سکول ہو اور تدریجاً پورے ملک میں ہائی سکولوں کو اس طرح پھیلا دیا جائے کہ میٹرک تک تعلیم، خرچ اور فاصلے کے لحاظ سے سہل الحصول ہو جائے نیز یہ کوشش بھی کی جائے کہ قریب قریب ہر گاؤں میں مکتب یا قرآنی مدرسے بھی قائم ہو جائیں۔

۱۲۔ ثانوی تعلیم تک جدید علوم کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان بچے کو اسلامی عقائد اور اسلامی زندگی کے ضروری احکام سے واقف کرایا جائے نیز ہر مسلمان بچے کو قرآن پڑھنے اور بہت حد تک قرآن کو سمجھنے کے قابل بھی بنا دیا جائے۔

۱۳۔ سکول اور کالج کی سطح پر فنی تعلیم وتربیت کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا جائے اور ہر تحصیل میں مردانہ اور زنانہ فنی اور حرفتی ادارے قائم کیے جائیں۔

۱۴۔ ملک سے ناخواندگی کو جلد سے جلد دور کرنے کے لیے ممکنہ تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس مقصد کے لیے شام کے وقت تمام سکولوں میں خواندگی کے مراکز قائم کیے جائیں اور تمام کارخانوں اور دفاتر میں ناخواندہ افراد کی تعلیم کا انتظام کیا جائے نیز تعلیم عامہ اور تاحیات تعلیم کے لیے جدید ترین تعلیمی ٹیکنالوجی سے کام لیا جائے۔اس کے ساتھ ساتھ ذہنی یا جسمانی طور پر معذور بچوں کے لیے سپیشل ایجوکیشن کے ادارے کھولے جائیں۔

۱۵۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تعلیم وتحقیق کے اعلیٰ ادارے قائم کیے جائیں۔ملک میں اعلیٰ سطح کی کئی سائنس اور ٹیکنالوجی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں جن میں ایٹمی اور شمسی توانائی کی تعلیم وتحقیق پر خصوصی توجہ دی جائے۔اس ضمن میں اعلیٰ سطح کے تربیتِ اساتذہ کے اداروں میں سائنس ایجوکیشن کے مراکز بھی قائم کیے جائیں۔

۱۶۔ نظام تعلیم وتربیت میں ہر سطح پر مسجد کے قیام کو مرکزی حیثیت دی جائے۔تمام

ثانوی مدارس، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مساجد تعمیر کی جائیں۔ اس طرح علم کا رشتہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استوار کیا جائے۔

۱۷۔ پیشہ ورانہ تعلیم سے متعلق طلب و رسد میں توازن لایا جائے جو لوگ با قاعدہ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے حامل ہوں ان کو ملازمت نہ ملنے تک ''بے روزگار الاؤنس'' دیا جائے۔

۱۸۔ قومی یکجہتی کے لیے ایسی تعلیمی پالیسی بنائی جائے کہ پاکستان کے کسی بھی علاقے کا طالب علم، پاکستان کے کسی بھی علاقے کے تعلیمی ادارے میں میرٹ کی بنیاد پر داخلہ لے سکے اور تمام مراعات سے مستفید ہو سکے۔

۱۹۔ ذرائع ابلاغ کو وزارت تعلیم سے وابستہ کر کے فروغ تعلیم کے لیے استعمال کیا جائے۔

۲۰۔ اقلیتوں کو اپنی کمیونٹی کی تعلیم کے لیے ہر ممکن آزادی اور انہیں تمام ضروری تعلیمی سہولتیں میسر کی جائیں۔

۲۱۔ سرکاری سطح پر یہ بات طے ہونی چاہیے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مسلمان شہری اس امر سے اجتناب کریں کہ وہ اپنے بچوں کو غیر اسلامی نظریات کے تحت چلنے والے سکولوں میں داخلہ دلائیں جو اس ملک میں چل رہے ہیں۔ خواہ یہ ادارے کتنی بڑی ترغیب ہی کیوں نہ دیں کیونکہ طلبہ پر ان اداروں کے بالعموم جو خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں ان سے ان کے دین و ایمان کو بڑا سخت ضعف پہنچتا ہے۔

۲۲۔ پاکستان میں کسی سرکاری یا نجی تعلیمی ادارے کو یہ اختیار نہ دیا جائے کہ وہ پاکستان کی بجائے کسی غیر ملکی تعلیمی ادارے سے الحاق کرے اور ان کے نصاب کے حوالے سے طلبہ کو تیار کرے۔ الحاق کی صورت میں ان اداروں کے طلبہ ان مضامین کی تدریس سے محروم رہتے ہیں جو پاکستان کے سرکاری مدارس میں لازمی ہیں مثلاً مطالعۂ اسلام، مطالعۂ پاکستان، تاریخ اسلام، اردو زبان وغیرہ۔ حقیقت میں یہی وہ اساسی مضامین ہیں جو نظریاتی حوالے سے انتہائی ضروری ہیں نیز سکول کی سطح پر غیر ملکی درسی کتب کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا جائے۔

۲۳۔ تعلیم و تحقیق کے ادارے نظام امتحانات کسی اصلاح کے ضمن میں منظم اور منضبط

تحقیق کریں۔ اس ضمن میں جدید کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے حوالے سے بھی جائزہ لیا جائے کہ یہ کس حد تک امتحانات کے نظام میں مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ نظام تعلیم میں طلباء کو معلومات دینے کے ساتھ ساتھ ان کی تشکیل سیرت کا سامان بھی پیش نظر رکھا جائے۔ نظام امتحانات میں بھی انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے تاکہ طلباء کی معلومات کی جانچ پرکھ کے ساتھ ساتھ ان کی سیرت وکردار کو بھی پرکھا جائے۔

۲۴۔ سارے تعلیمی عمل کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ معاشرہ میں اساتذہ کا مقام ومرتبہ بلند کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے فوری طور پر درج ذیل اقدامات کیے جائیں:

الف۔ فن تعلیم وتربیت میں بہتر اور جدید تعلیمی ٹیکنالوجی اور سہولتوں کے لیے ملکی سطح پر ایک خودمختار ''ٹیچر ایجوکیشن یونیورسٹی'' قائم کی جائے جو نظریہ پاکستان کی روشنی میں اعلیٰ تعلیم وتحقیق کے پروگراموں کے لحاظ سے مثالی ہو اور جہاں حقیقی معنوں میں نظریاتی اور علمی وفنی نقطہ نظر سے ماہر معلم تیار ہوں۔

ب۔ ہر صوبہ میں ایک ''انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ایجوکیشن اینڈ ریسرچ'' (آئی،آئی، ای،آر) قائم کیا جائے جو نظریاتی تناظر میں تحقیقی کام بھی کرے اور تربیت اساتذہ کی مختلف سطحوں سے متعلق نصابیات کی تشکیل کا کام بھی۔ نیز یہ مجوزہ ادارہ اساتذہ کی قبل از ملازمت اور دوران ملازمت تربیت کا بھی بندوبست کرے۔

ج۔ تعلیمی اداروں کی سطح اور پوسٹ کا لحاظ کیے بغیر اساتذہ کو ان کی علمی اور پیشہ ورانہ قابلیت کے مطابق تنخواہیں دی جائیں اور بہتر شرائط کار کا انتظام کیا جائے۔

بلاشبہ کسی بھی ملک کی بقاء اور ارتقاء کا انحصار اس کے اچھے نظام تعلیم پر ہے۔ جب تک ہمارے پاس صحیح معنوں میں قابل، مخلص، تحقیق کے دلدادہ اور قابل رشک کردار کے حامل اساتذہ، ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، جرنیل، ایڈمنسٹریٹرز، سول سرونٹس، صحافی اور سیاست دان نہیں ہوں گے، ہم کسی ترقی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، خواہ ہمارے پاس دولت اور اسلحہ کے انبار ہی کیوں نہ جمع ہوجائیں۔ یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ آخر ہمارا علم وہ مقاصد کیوں پورے نہیں کررہا جس سے ایسے عالی کردار شخصیت کے مالک افراد تیار ہوسکیں۔ ہماری ہزارہا ڈگریاں کیوں بے اثر ہوکر رہ گئی ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ علم کا اطلاق صحیح نہیں، کہیں علم کا رشتہ

جان کی بجائے محض جسم سے تو استوار نہیں ہو گیا۔ ہمیں اگر پاکستان میں اپنے راہرو علم کو صحیح راہ پر گامزن کرنا ہے تو لازماً درج بالا تجاویز پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

خلاصہ

حقیقت میں پاکستان کا نام آتے ہی یہ تصور اُبھرتا ہے کہ یہ ہمارا قومی گھر ہے جسے باہر کے حملوں سے بھی بچانا ہے اور اندر کے فتنوں سے بھی اسی طرح تحفظ پاکستان کے بنیادی فریضہ کا تصور اُبھرتا ہے جس کی شرط اول پاکستان کے لیے سچا جذبہ محبت ہے۔ مگر محبت پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کے صحیح نصب العین کا شعور موجود ہو اور اس کی تعمیر اور حفاظت کے لیے جس طرح کی مشنری رضا کارانہ جذبات کی ضرورت ہے وہ کارفرما ہوں۔ یہ کام لازماً تعلیم ہی کے ذریعے ہوگا۔ قومی تقاضوں کے حوالے سے تعلیم کی نظریاتی تشکیل میں ہمیں اس بات کا بھی گہرا شعور ہونا چاہیے کہ علامہ اقبال اور قائداعظم کی کاوشوں سے پاکستان اس لیے نہیں بنا کہ یہ قبیلوں، نسلوں، لسانی اور علاقائی گروہوں کا دنگل بنا رہے۔ پاکستان کی غرض یہ بھی نہیں ہوسکتی کہ یہ غیر ممالک کی تحریر فکر وثقافت کی نقل درج کرنے کا تختہ سیاہ ہو۔ پاکستان ایسا بے معنی خط بھی نہیں کہ زمانے کے تندرو دریا میں بغیر سوچے سمجھے اس سفینے کو ڈال دیا جائے جس میں کروڑوں افراد لدے ہیں اور ہمارا کوئی منتہانہ ہو کہ اسے جانا کہاں ہے اور اسے کس کس خطرے اور موڑ سے بچانا ہے؟ پاکستان کرائے کا ایک ایسا ہال بھی نہیں کہ اس میں کچھ لوگ جب چاہیں اس کے اساسی نظریہ اور یکجہتی کے خلاف اپنے دل کا غبار نکالیں۔ پاکستان کو اگر اسلامی نصب العین رکھنے والے ملک کی حیثیت سے سامنے رکھا جائے تو اس کے تحفظ کے لیے عسکری، تکنیکی اور اقتصادی قوت بلاشبہ ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری ایمان کی قوت ہے، پھر علم کی، پھر اخلاقی قدروں کی۔ ان قوتوں سے اگر نظام تعلیم، اساتذہ اور نوجوان نسل کو آراستہ کرے لا سکے تو وہ ذہنی غلامی کے اس چکر سے نکل آئیں گے اور ان کے اذہان وقلوب میں صدیوں کا جما ہوا احساس کمتری کھرچ کر نکالا جا سکتا ہے اور وہ دنیا کے سامنے وہ توحید کا انقلابی علم اس احساس سے بلند کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس وہ عظیم پیغام اور نظام ہے جس سے تمام انسانیت محروم ہے اور ہم تمام انسانیت کے معلم ہیں۔ صرف ایسے لوگ ہی سپر پاور کے سامنے اس چیلنج کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں کہ تم ہمیں خرید نہیں سکتے۔ تم ہماری حیوانی خواہشات کو اکسا کر ہماری انسانی اور ایمانی عظمت کی گردن میں خم نہیں پیدا کر سکتے۔ تم ہمیں تعمیرِ پاکستان اور تحفظِ مقصدِ پاکستان کے معرکوں میں شکست نہیں دے سکتے۔

تحقیق ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

علومِ اسلامیہ ۔ دائرہ ہائے تحقیق

فکرِ اسلامی کے نئے موضوعات جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے

تحقیق کی دو صورتیں عام طور پر رائج ہیں: ایک یہ کہ کسی مخطوطے کے چند نسخے حاصل کر لیے جائیں اور ان کا موازنہ کرتے ہوئے اس مخطوطے کو ایڈٹ کر دیا جائے۔ کسی نسخے میں کون سا لفظ چھوٹ گیا ہے؟ کس نسخے کی عبارت میں تھوڑا سا فرق ہے؟ اور داخلی شہادتوں کی روشنی میں کون سا نسخہ سب سے زیادہ معتبر ہے؟ ان چیزوں کی وضاحت کر دی جائے۔ عالمِ عرب میں اس طرز کا کام بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ اس طرح قدیم مصادر و مراجع کے نئے تحقیقی ایڈیشن منظرِ عام پر آئے ہیں۔ تحقیق کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخصیت کو لے کر اس کے حالاتِ زندگی بیان کر دیے جائیں اور اس کی علمی، دینی یا رفاہی خدمات کا تعارف کرا دیا جائے، یا کسی مصنف کی کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے اس کے منہجِ تالیف سے بحث کی جائے، یا کسی دَور کو متعین کر کے اس میں ہونے والے کاموں کا تجزیہ کیا جائے اور اس دَور کی اہم شخصیات کا تذکرہ کر دیا جائے۔ تحقیق کی یہ دونوں صورتیں افادیت رکھتی ہیں اور ان کے مطابق بڑے پیمانے پر کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے، لیکن تحقیق کی اعلیٰ صورت یہ ہے کہ فکری موضوعات پر کام کیا جائے اور ایسے مباحث اٹھائے جائیں جن میں معاشرے کو درپیش نت نئے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہو۔

الحمد للہ! اسلامیات کے میدان میں بحث و تحقیق کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے اور خواتین بھی اس میں سرگرمی سے حصہ لے رہی ہیں لیکن زیادہ تر کام روایتی انداز کا ہے۔ تیزی سے بدلتی دنیا میں ضرورت ہے کہ جو بہت سے نئے موضوعات سامنے آ رہے ہیں ان پر اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام کیا جائے۔ یہ موضوعات بہت سے ہیں اور ان کا دائرہ عقائد و الٰہیات، تہذیب و معاشرت، سیاست و معیشت، بین الاقوامی امور و مسائل اور دیگر میدانوں کو محیط ہے۔ پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی نے اپنے کتابچے 'معاصر اسلامی فکر: چند توجہ طلب مسائل' میں ایسے بہت سے موضوعات کی نشان دہی کی ہے جن پر موجودہ حالات میں کام کرنے کی

ضرورت ہے۔ ذیل میں چند موضوعات کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

* وجود باری تعالیٰ، اس کی صفات اور شانِ الوہیت کی تفہیم جدید۔
* اسلام کا تصوّرِ توحید اور منکرینِ خدا، متشککین اور ملحدین کے اعتراضات وشبہات کا تنقیدی جائزہ۔
* حاکمیتِ الٰہ کا تصوّر۔ * وحدۃ الوجود اور اسلامی تصورِ توحید۔
* وحی ورسالت کا قرآنی تصور اور عقل انسانی کی نارسائی۔
* ایمان بالغیب کی تفہیم جدید۔
* قرآن مجید اور سائنسی حقائق کے درمیان تطبیق اور موافقت یا مخالفت کے پہلوؤں کی تحقیق۔
* نئے دستوری، سیاسی اور سماجی مسائل میں سنتِ نبوی سے استفادہ کی حدود۔
* نئے حالات میں اسلامی زندگی کی تشکیل میں اجتہاد کے امکانات۔
* نئے احکام کے استنباط میں مقاصدِ شریعت کی رعایت۔
* بدلتے ہوئے حالات میں نئے علم کلام اور فقہ کی تدوین۔
* اسلامی حدود وتعزیرات کی معقولیت کا اثبات * ارتداد اور آزادیٔ ضمیر کا مسئلہ۔
* نفاذِ حدود میں جدید وسائل وذرائع سے استفادہ کی حدود۔
* مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان مکالمہ کی ضرورت اور اس کی حدود۔
* اسلامی فلسفۂ تاریخ کی تدوینِ نو۔
* نئے تناظر میں معاشرہ میں عورت کا مقام اور اس کے سیاسی وسماجی حقوق۔
* وراثت، شہادت اور طلاق وغیرہ میں عورت کے ساتھ مرد سے مختلف سلوک کی حکمتیں
* عائلی قوانین کی اصلاح: تعدّدِ ازواج کے حق کی تحدید، طلاق کے اختیار کو بعض آداب کا پابند بنانا، حقِ خلع کی تجدید، مطلقہ کے حقوق، ایک ساتھ تین طلاق کا مسئلہ، وغیرہ۔
* اسلامی ریاست میں قانون سازی اور انتظامِ مملکت میں غیر مسلموں سے اشتراک کی حدود
* مسلمان اقلیتوں کا سیاسی موقف۔ * بین الاقوامی تعلقات۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۴)

جدید تعلیم عبدالوہاب سلیم

جدید تعلیمی ادارے اور الحاد

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

[illegible] [۱]

''ہر بچہ ملت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا عیسائی یا مشرک بنا دیتے ہیں۔''

ایک دوسری حدیث میں ملۃ کی جگہ فطرۃ کا لفظ ہے۔ اصل میں ان دونوں کا مطلب ایک ہی ہے جو اسلام ہے، جیسا کہ محدثین نے اس کی وضاحت کی ہے، کیونکہ یہاں فطرت سے مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ ربّ العزت نے عالم ارواح میں ہم سب سے لیا تھا کہ [illegible] بِرَبِّكُمْ اور ہم سب نے اس کے جواب میں کہا تھا: کیوں نہیں اے ربّ العالمین!

یہی بچہ جو اصلاً مسلمان اور مومن ہوتا ہے جب ہوش سنبھالتا ہے تو اپنے والدین اور ارد گرد رہنے والوں کی نقل کرنے لگ جاتا ہے اور اُن ہی جیسا بن جاتا ہے۔ اس حدیث اور اس کی تشریح کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بچوں کی تربیت کی بہت زیادہ اہمیت ہے!

ہمارے معاشرے میں بچے ذرا سا ہوش سنبھالتے ہی سکول میں داخل کر دیئے جاتے ہیں اور والدین سے بھی زیادہ اثر بچے اپنے سکول کے اساتذہ اور ارد گرد کے بچوں کا لیتے ہیں اور یہیں سے بچوں کی وہ ذہنی نشوونما ہوتی ہے جس سے ان کے رجحانات کا تعین ہوتا ہے۔

پاکستان میں حالیہ کچھ عرصے سے اپنوں اور اغیار کا خاص نشانہ ہمارا نظامِ تعلیم ہے کیونکہ یہی وہ نسلِ نو ہے جو کل کلاں اس ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالے گی۔ زمانہ طالب علمی وہ دور ہوتا ہے جس میں اذہان ہر نئی چیز کو قبول کرتے ہیں اور اگر مناسب وقت پہ رہنمائی نہ کی جائے تو یہ نئے خیالات اور نظریات ذہن کے مستقل مکین ہو جاتے ہیں اور اس نوخیز دماغ کو کسی نہ کسی فتنے کی آماجگاہ بنا دیتے ہیں، نعوذ باللہ من ذلك.

---

[۱] سنن ترمذی، ۲۱۳۸

گزرے چند برسوں میں جدید تعلیمی اداروں اور وہاں پڑھنے والے طلبا کے لیے جو نیا فتنہ بھرپور طریقے سے آیا ہے وہ سیکولرازم اور لبرل ازم ہے جس کی انتہا الحاد ہے اور یہی آج کی تحریر کا موضوع ہے۔

یقیناً بہت سے لوگ اس بات سے چونک گئے ہوں گے اور بہت سے ایسے ہوں گے جو اس سے اتفاق نہیں کر پا رہے ہوں گے لیکن یہ فتنہ ہمارے در تک اچانک تو آیا نہیں کہ جس کے آنے کا معلوم ہو جاتا بلکہ اس کے پیچھے برسوں کی وہ پلاننگ ہے جس کی وجہ سے یہ فتنہ اب زور آور ہو چکا ہے۔ اس پلاننگ میں نصاب پر اثر انداز ہونا، معلمین کی ایسی کھیپ جو اِن مقاصد کے لیے فائدہ مند ہو، پھر تعلیمی اداروں کا ماحول ایسا بنا دیا جانا کہ مذہب پر عمل کرنا مشکل تر اور لہو ولعب کی محافل آسان تر لگیں۔ ایک اور حربہ جو استعمال کیا گیا وہ این جی اوز کا تعلیمی اداروں میں بڑھتا ہوا رسوخ ہے۔

نصابِ تعلیم کے حوالے سے دیکھا جائے تو قیام پاکستان کے فوری بعد لارڈ میکالے کے لائے گئے اس نظام تعلیم کو ہی پاکستان کا نظام تعلیم بنا دیا گیا جس کے بارے میں اس نظام کے بانی لارڈ میکالے نے خود کہا تھا کہ اس نظام تعلیم سے ہم ایسے افراد تیار کریں گے جو ہوں گے تو ہندوستان کے رہنے والے لیکن وہ وفادار انگریزوں کے ہوں گے یعنی سادہ لفظوں میں کالے انگریز! بدقسمتی سے پاکستان میں بھی وہی نظام تعلیم نافذ العمل رہا اور اس کے ساتھ ساتھ برطانوی دور کے چھوڑے ہوئے مشنری سکولز جوں کے توں قائم رہے جن میں عیسائی تربیت یافتہ اساتذہ پڑھاتے تھے۔ مزید برآں ہماری اس سائیکی نے کہ انگلش زبان ہی ترقی کا زینہ ہے ہم نے امریکن سکول سسٹم اور برطانوی سکول سسٹم اپنے ہاں برآمد کیے۔ ان سسٹمز کے تحت چلنے والے سکولوں میں نصاب مکمل طور پر غیر اسلامی ہے جس میں اردو اور اسلامیات کی کتب کو شامل تو کیا گیا لیکن ان میں ایسے اسباق شامل کیے گئے جو بچے کے نظریات مضبوط کرنے کی بجائے ان میں تشکیک پیدا کرتے ہیں۔ سکولوں میں تو یہاں تک ہے لیکن یونیورسٹی سطح پر آزادیٔ اظہارِ رائے کے نام پر کورس آؤٹ لائن کے نام پر عجیب گُل کِھلائے جاتے ہیں جہاں ایسی اسائمنٹس اور پروجیکٹس کرائے جاتے ہیں جو تشکیک کو جنم دیتے ہیں اور جو الحاد کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ یہ نصاب عموماً غیر ملکی این جی اوز، پاکستان میں کام کرنے والے

آزادی اظہار رائے کے ادارے مل کر بناتے ہیں اور اس پہ عمل کرانے کے لیے اگلا قدم اساتذہ کی تربیت ہوتی ہے۔

کسی بھی نصاب کو عملی طور پر کامیاب کرنے کے لیے یقیناً اساتذہ ہی کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں میں دیارِ غیر سے پڑھے اساتذہ کو ترجیح دی جاتی ہے اور یہ معمارِ قوم اپنی حب الوطنی اور دین پہلے ہی یرغمال بنا کر آ چکے ہوتے ہیں۔ یا پھر مقامی طور پر تربیت یافتہ اساتذہ کو بار بار ٹریننگ کے نام پر این جی اوز سے تیار کروایا جاتا ہے جس سے ان کے اذہان بھی کسی نہ کسی حد تک بدل ہی جاتے ہیں۔ نصاب اور استاد دونوں جب بدل جائیں تو پھر تشکیک کا بیج باآسانی معصوم ذہنوں میں نمو پانے لگتا ہے۔

عبدالوارث گل صاحب ایک معروف مبلغ ہیں اور حقوق الناس ویلفیئر فاؤنڈیشن کے سربراہ ہیں۔ گل صاحب عیسائیت سے اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے اور ان کو اس سفر میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی مشکلات سے لوگوں کو بچانے کے لیے انہوں نے یہ تنظیم بنائی جو پاکستان میں موجود غیر مسلم اقلیتوں کو قبول اسلام کی دعوت دیتی اور ان کو درپیش مشکلات کے حل اور الحاد کے خلاف کام کرتی ہے۔

ایسے کئی واقعات کے وہ شاہد ہیں۔ بتانے لگے کہ کانونٹ سکول میں عیسائی خواتین اساتذہ یہ کرتی ہیں کہ ٹیچر نرسری کلاس میں داخل ہوئی اور کہنے لگی سب اپنے گاڈ سے چاکلیٹ مانگو۔ ہر بچہ اپنے اعتقاد کے مطابق مانگنے لگا لیکن چاکلیٹ نہیں ملی۔ اب ٹیچر نے کہا کہ ہم یسوع مسیح علیہ السلام سے مانگتے ہیں۔ بچوں نے آنکھیں بند کیں اور جیسا کہ پہلے سے انتظام موجود تھا، اس دوران چھت سے چاکلیٹیں گرنے لگیں۔ اب اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ قارئین خود ہی سوچ لیں۔

بچوں کے معصوم ذہنوں میں چونکہ اللہ عزوجل کا تصور یہی ہوتا ہے کہ وہ سنتا ہے اور فوری دیتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح کی منصوبہ بندی کے ساتھ کام کیا جاتا ہے لیکن اس سے ذرا بڑے بچوں کے ساتھ تھوڑا مختلف طریقے سے کام کیا جاتا ہے۔

گزشتہ برس ایک سکول ٹیچر انوار احمد کی وڈیو تو سوشل میڈیا پر سرگرم بہت سے احباب نے دیکھی ہوگی جس میں وہ نہم کلاس کے بچوں کو پڑھاتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ یہ جنت، جہنم اور حوریں یہ سب مولویوں کی کارستانی ہیں حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ صرف گورنمنٹ سکول میں پڑھانے والے ایک ٹیچر کا طریق تدریس ہے۔ اس طرح کے ان گنت واقعات اب تعلیمی اداروں میں عام ہورہے ہیں جن سے ہم آپ بے خبر ہیں۔

تشکیک پیدا کرنے کے لیے جو الحاد کی پہلی سیڑھی ہے، ہر طرح کے مضامین سے مدد لی جاتی ہے۔ آپ اسلامیات پڑھ رہے ہیں تو اسلامی تاریخ کے بارے ابہام پیدا کرنا مثلاً یہ باور کرانا کہ مسلمان جب مضبوط تھے تو انہوں نے قتل عام کیا، احادیث کی سند کو مشکوک ٹھہرانا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت کو غلط ثابت کرنا وغیرہ۔ ادبی مضامین کا تو اللہ ہی حافظ ہے کہ ناول اور افسانوں میں محبت و عشق کے نام پہ براہ راست اللہ سے شکوے شکایتیں اور جنگ کرنا، اسی طرح سوشل سائنس کے مضامین میں خاندانی نظام، غربت، معاشرے کے اندر بڑھتی عدم رواداری اور اس پر مذہب کو قصور وار ٹھہرانا اور اس طرح منفی نفسیاتی رویوں سے اسلام پر عمل نہ کرنے کا جواز پیدا کرنا۔

سائنس کے مضمون میں ڈارون کی تھیوری کو اس شد و مد سے پڑھانا کہ کہیں نہ کہیں پڑھنے والا اس کا قائل ہو ہی جائے، تخلیق کائنات کے متعلق عجیب و غریب باتیں کرنا مثلاً یہ کائنات خود کار حیاتیاتی قوانین کی وجہ سے خود بخود وجود میں آ گئی ہے یا اس کی وجہ بگ بینگ ہے۔ یہ سب وہ نکات ہیں جو ایک عام طالب علم کو آسانی سے الحاد کی طرف لے جاتے ہیں اور ارد گرد مذہب کی مناسب رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے یہی نظریات اس کو دین سے برگشتہ کرنے لگ جاتے ہیں یا پھر اس کا ایک اور ردّ عمل یہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے طلباء شدت پسندی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ اپنے سوالوں کے جواب نہ پا کر گالی گلوچ، دوسروں کو گمراہ اور کافر قرار دینے لگتے ہیں اور آخر کار خارجیت کی راہ اپنا لیتے ہیں۔ اس امر کی نشاندہی سندھ حکومت بھی کر چکی ہے کہ یونیورسٹیوں کے طلباء اس قسم کی شدت پسندی کا شکار ہیں اور اس کی مثال صفورہ بس کیس کے نامزد ملزم بھی ہیں۔

تشکیک کے اس سفر میں آغاز ان باتوں سے کیا جاتا ہے کہ آپ کے ذہن میں جو بھی

سوال ہے وہ پوچھیے! اگرچہ یہ ایک مثبت بات ہے لیکن اس کو بنیاد بنا کر مذہب کے خلاف سوال اٹھائے جاتے ہیں، اس طرح کے ایک واقعہ کا میں خود شاہد ہوں کہ ہمارے لیکچرار نے کلاس میں اعلان کیا کہ آپ جو سوال پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیے۔ایک ساتھی نے سوال کیا کہ احادیث کے بارے میں اکثر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں ان کا کیسے جواب دیا جائے؟ لیکچرار خود اسی قبیل سے تھے کہنے لگے بیٹا اب باتیں تو ان کی ٹھیک ہیں نا، دیکھیں امام بخاری نے بھی تو دو لاکھ حدیثیں ضائع کیں تھیں۔اب اس سوال کو لے کے بہت دن بحث ہوتی رہی اور بہت سے طلباء کے ذہن میں بیٹھ گیا کہ امام بخاری نے احادیث ضائع کی ہیں اور احادیث کا جو مجموعہ ہم تک پہنچا ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

تیسرا جو حملہ کیا گیا وہ این.جی اوز اور اسی قبیل کی تنظیموں کا حملہ تھا جو ریسرچ اور تفریح کے نام پر تعلیمی اداروں میں تقریبات منعقد کرتی رہتی ہیں اور مختلف اوقات میں ٹریننگ سیشنز اور دیگر پروگرام کرتی ہیں اور ان اداروں میں ہونے والے مختلف حیاباختہ پروگراموں کو بھی سپانسر کرتی ہیں۔ ان کا طریقہ واردات بھی غیر محسوس سا ہوتا ہے مثال کے طور پہ مختلف سوالنامے پُر کروانا، جن میں عجیب وغریب سوالات ہوتے ہیں، مثلاً آپ مذہب پر کتنا عمل کرتے ہیں؟ آپ کو اللہ پر کتنا یقین ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ دین ہماری موجودہ عصری ضروریات کو سمجھتا ہے؟ اسی طرح یہ احساس پیدا کرنا کہ اسلام آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ مذہب اور دنیاوی زندگی الگ معاملات ہیں۔اسی طرح دینی موضوعات پہ سیمینار کا انعقاد اور ان میں ایسے لوگوں کو دینی اسکالرز کے نام پہ بلایا جانا جو خود ماڈرن فکر کے ہوتے ہیں اور ان کو اس طرح متعارف کرانا کہ یہ دین کی جدید تعبیر کو سمجھتے ہیں اور فرقہ واریت سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ سب وہ حربے ہیں جن کی مدد سے تشکیک، لبرل ازم اور سیکولرزم کو فروغ دیا جاتا ہے اور یہی مراحل آخر کار الحاد پر منتج ہوتے ہیں، اِلَّا مَنۡ رَحِمَ رَبِّیۡ!

اب کرنا کیا چاہیے؟ یقیناً اللہ کا یہ دین اسلام قیامت تک کے لیے آیا ہے اور اس نے غالب ہو کے رہنا ہے اور ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم خود اس پر عمل کریں، دوسروں کو اس پر عمل کی ترغیب دیں اور اس دین کی سربلندی کے لیے کچھ کر جائیں۔

اس کا پہلا قدم تو یہ ہے کہ گھر میں بچوں کی اسلامی تربیت کا انتظام کیجیے، ان کے سوالات

کا جواب دیجیے، اپنے بچوں کو اللہ عز وجل کا مکمل تعارف کروائیے، اسلام کے محاسن سے آگاہ کیجیے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بطور مبلغ قربانیوں سے ان کو روشناس کروائیے، اسلامی تاریخ کا مطالعہ کروائیے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے روشن کردار کا بتائیے، تدوین حدیث اور محدثین کی لازوال محنت سے انہیں آگاہ کیجیے۔

کچھ نہ کچھ اسلامی سکول معاشرے میں موجود ہیں، ان میں اپنی اولاد کو بھیجیں، ان کے نظریات وخیالات کا مکمل احتساب کریں، اگر آپ کو ایسے تعلیمی ادارے نہیں ملے اور آپ کی اولاد یا بہن بھائی ایسے اداروں میں داخل ہیں تو ان کی سرگرمیوں اور افکار پر نظر رکھیں اور تعلیمی ادارے کے پراگندہ ماحول کے اثرات کا مداوا کرنے کی کوشش کریں۔انہیں گھر اور مسجد میں بہتر ماحول فراہم کریں۔

تعلیمی اداروں میں بعض اچھے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔انہیں چاہیے کہ بطور معلم اپنے فرائض کا احساس کریں اور طلباء کی علمی اور نظریاتی بنیادیں مضبوط کریں۔این جی اوز کے مدمقابل جو اسلامی، علمی اور رفاہی تنظیمیں ہیں، اگرچہ وہ بہت کم ہیں، لیکن ان کا وجود غنیمت ہے اس لیے ان کی ہر ممکن مدد کریں۔

ان فتنوں نے ہمارے اندر اس لیے جگہ بنالی ہے کہ ہمارا اپنا رشتہ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین سے مضبوط نہیں رہا۔اس کو مضبوط بنائیں اور اس کو مضبوط کرنے کے لیے مساجد جو کہ اللہ کے گھر ہیں ان کو نوجوان نسل میں مقبول بنایا جائے۔ان کا ماحول اس طرح کا بنایا جائے کہ آج کا نوجوان ادھر آنا پسند کرے اور اس کا دل وہاں سکون محسوس کرے۔ وہاں ایسی سرگرمیاں شروع کی جائیں جو فرقہ واریت سے بالاتر ہوں، خالص قرآن وسنت کی تعلیمات پر مشتمل ہوں۔ جدید ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر پڑھائی جائے، احادیث نبویہ کے دروس دیئے جائیں جن میں جدید نسل کے سوالات کے جوابات ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے دلوں کو ایمان سے منور کرے اور الحاد، لبرل ازم اور اس قبیل کے دوسرے فتنوں سے ہمیں بچائے اور ہماری نئی نسل دین پر چلنے والا بنائے۔

(بشکریہ اسوۂ حسنہ، کراچی)

تزکیۂ نفس عبدالمالک

آخرت میں کامیابی کا تیربہدف نسخہ

"یہ سبق مجھے میرے والد نے دیا تھا' میں دن رات ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور صدق دل سے ان کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں"....وہ رکا، رومال سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا اور بولا "میرے والد کو سردی کا مرض لاحق تھا، وہ گھر میں بھی اوور کوٹ پہن کر پھرتے تھے، میرے والد جون جولائی میں بھی دھوپ میں بیٹھتے تھے، ان کی جلد جل کر سیاہ ہو جاتی تھی لیکن ان کی سردی کم نہیں ہوتی تھی۔ وہ گرمیوں میں بھی لحاف لے کر سوتے تھے، پاؤں میں ڈبل جرابیں پہنتے تھے اور صبح شام ہیٹر کے قریب بیٹھتے تھے۔ سردیاں ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی تھیں اور وہ اکتوبر میں کپکپانا شروع کر دیتے تھے۔ ہم انہیں اکتوبر سے مارچ تک دوبئی شفٹ کر دیتے تھے، وہ چھ ماہ دوبئی میں رہتے تھے اور چھ ماہ لاہور میں۔ اللہ تعالیٰ نے اس خوفناک بیماری کے باوجود ان پر بڑا کرم کیا تھا، وہ ارب پتی تھے، وہ حقیقتاً مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے تھے تو وہ سونا بن جاتی تھی۔

وہ دنیا کے مشہور ترین ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے لیکن اس خوفناک مرض نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آخری عمر میں وہ سنکی ہو گئے تھے، وہ روز مجھے اپنے پاس بٹھاتے' میری ٹھوڑی پکڑتے اور نمناک آواز میں کہتے تھے: عبدالمالک! مجھے موت سے بہت ڈر لگتا ہے' میں جب سوچتا ہوں کہ میں زمین سے چھ فٹ نیچے پڑا ہوں گا' اندر اندھیرا اور سردی ہو گی اور میرے بدن پر صرف دو چادریں ہوں گی تو میری روح تک کانپ جاتی ہے۔ عبدالمالک! کیا تم میرا ایک کام کرو گے؟ میں ہر روز جواب دیتا: ابا جی آپ حکم کریں' میں جان لڑا دوں گا۔ میرے والد بڑی لجاجت سے فرماتے: بیٹا تم کسی سے فتویٰ لے کر مجھے گرم کپڑوں میں دفن کر دینا، یہ ممکن نہ ہو تو تم کم از کم میری قبر کو گرم رکھنے کا کوئی بندوبست ضرور کر دینا۔ میں فوراً حامی بھر لیتا تھا، میرا خیال تھا میں کسی نہ کسی عالم سے فتویٰ لے کر ابا جی کو اوور کوٹ میں دفن کر دوں گا۔ میں ان کی قبر بھی گرم اینٹوں سے بنوا دوں گا۔ ہم لوگ امیر تھے، مَیں اکثر سوچتا تھا اگر کوئی عالم تیار نہ ہوا تو میں فتویٰ خرید لوں گا' مجھے جتنی بھی رقم خرچ کرنا پڑی، کر دوں گا لیکن مَیں اپنے والد کی

آخری خواہش ضرور پوری کروں گا"....وہ رکا' ٹھنڈی آہ بھری اور بولا"لیکن مَیں فیل ہو گیا' میرے والد 2000ء میں فوت ہو گئے۔ہم نے انہیں گرم پانی سے غسل دیا' انہیں اوورکوٹ پہنایا اور اس اوورکوٹ پر کفن لپیٹ دیا۔مولوی صاحب نے جب اوورکوٹ دیکھا تو جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔میں نے انہیں ہر قسم کا لالچ دیا' میں نے ان کی منت بھی کی لیکن وہ نہ مانے۔میں نے تنگ آ کر انہیں دھمکی دی، وہ جنازہ چھوڑ کر چلے گئے۔ہم نے اس کے بعد بے شمار مولویوں سے رابطہ کیا لیکن کوئی نہ مانا یہاں تک کہ میں نے خود جنازہ پڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔مَیں جب والد کی میت کے پیچھے کھڑا ہوا تو لوگوں نے جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا۔مَیں نے ان کی بھی منتیں کیں لیکن وہ نہ مانے۔

والد کی قبر کا بھی ایشو بن گیا، میں قبر میں "انسولیشن" کرانا چاہتا تھا لیکن لوگوں نے اعتراض شروع کر دیا۔پورے شہر کا کہنا تھا قبر ہمیشہ اندر سے کچی ہوتی ہے۔فرعونوں کے علاوہ آج تک کسی شخص کی قبر اندر سے پکی نہیں ہوئی۔یہ بدعت ہے اور ہم اس بدعت کا حصہ نہیں بنیں گے میں مصیبت میں پھنس گیا یہاں تک کہ میرے پاس لوگوں کی بات ماننے کے سوا کوئی آپشن نہ بچا۔مجھے والد کا اوورکوٹ بھی اتارنا پڑا اور قبر بھی توڑنی پڑی۔مَیں نے بڑے دکھی دل کے ساتھ اپنے والد کو دفن کیا اور قبر پر دیر تک روتا رہا۔مَیں جب بھی سوچتا تھا میں اپنے والد کی معمولی سی خواہش پوری نہیں کر سکا تو میری ہچکی بندھ جاتی تھی۔مَیں اس کے بعد جب بھی والد کی قبر پر جاتا تھا،شرمندگی سے سر جھکاتا تھا اور ان سے معافی مانگتا تھا۔

یہ سلسلہ مہینہ بھر جاری رہا۔ایک رات مَیں گہری نیند سویا ہوا تھا، میرے والد میرے خواب میں آئے، وہ سفید کفن میں ملبوس تھے، انہیں شدید سردی لگ رہی تھی، وہ کپکپا رہے تھے اور مجھے بلا رہے تھے۔عبدالمالک،عبدالمالک! اٹھو اور میری بات سنو! میں نے خواب میں ان کی طرف دیکھا، وہ بولے: میرے بیٹے مَیں تمہیں زندگی کی وہ حقیقت بتانا چاہتا ہوں جو مجھے مرنے کے بعد معلوم ہوئی۔مَیں نے عرض کیا' اباجی میں غور سے سن رہا ہوں، آپ فرمائیے۔وہ بولے، بیٹا مَیں ارب پتی تھا، مَیں چیک پر خود دستخط نہیں کرتا تھا، میرے منیجر کرتے تھے۔مَیں زمین جائیداد کا مالک بھی تھا اور مَیں تم جیسے سعادت مند بیٹوں کا باپ بھی تھا لیکن تم اور میری ساری دولت مل کر بھی میری ایک خواہش پوری نہ کر سکے۔مَیں گرم کپڑوں اور

گرم قبر میں دفن نہ ہو سکا۔ مَیں نے اس سے یہ جانا کہ انسان کی ساری دولت اور ساری آل اولاد مل کر بھی موت کے بعد اس کی مدد نہیں کر سکتی، یہ قبر میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ یہ سب اگر مجھے قبر میں دفن کرنے سے پہلے ایک اوور کوٹ نہیں پہنا سکے تھے تو یہ اس سے آگے کے سفر میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے؟ چنانچہ مَیں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ دولت وہ ہے جو مرنے کے بعد بھی آپ کا ساتھ دے۔ اور اولاد وہ ہے جو زندگی کے بعد بھی اولاد رہے۔ مَیں نے عرض کیا، ابا جی آپ کی بات یقیناً ٹھیک ہو گی لیکن مَیں پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ وہ مسکرائے اور فرمایا: دولت اور اولاد کو صالح بناؤ‘ یہ مرنے کے بعد بھی تمہارے کام آتی رہے گی۔ ورنہ دوسری صورت میں یہ تمہارے امتحان میں اضافہ کرتی رہے گی۔ میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا‘ وہ بولے‘ بیٹا میں نے پوری زندگی دولت کمائی، مَیں اس کا 99 فیصد حصہ دنیا میں چھوڑ گیا۔ یہ 99 فیصد حصہ میرے بعد نااہل ثابت ہوا جبکہ مَیں نے اس کے ایک فیصد سے یتیم اور غریب بچوں کے لیے سکول بنایا تھا‘ دولت کا وہ ایک فیصد حصہ میرے لئے صالح ثابت ہوا، وہ آج بھی میرے کام آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تم سمیت چھ بچے دیے تھے، میں نے ان تمام بچوں کو پریکٹیکل بنا دیا‘ یہ بچے دنیادار ہیں‘ یہ زندگی میں مجھ سے زیادہ کامیاب ہیں، یہ دھڑا دھڑ پیسہ کما رہے ہیں لیکن مجھے آج ان سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ ہاں! البتہ مَیں نے اپنے خاندان کی ایک یتیم بچی کو تعلیم دلائی تھی، وہ بچی ڈاکٹر بن گئی‘ وہ ڈاکٹر ہفتے میں دو دن غریب مریضوں کا مفت علاج کرتی ہے، مجھے ان دو دنوں کا بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ وہ بچی اور اس کے دو دن میرے لئے صالح ثابت ہو رہے ہیں۔ چنانچہ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنی دولت کا ایک فیصد اپنے اوپر خرچ کرو اور 99 فیصد کو صالح بنا دو تم مرنے کے بعد بھی خوش حال رہو گے اور تم اپنی اولاد کو کاروبار کے ساتھ ساتھ ویلفیئر پر لگا دو، یہ صالح ہو جائے گی اور یہ صالح اولاد تمہیں صدیوں تک نفع پہنچاتی رہے گی۔ میرے والد اٹھے، میرا ماتھا چوما اور چلے گئے، میرا خواب ٹوٹ گیا‘ میں جاگ کر اٹھ بیٹھا۔

....وہ رکا، لمبا سانس لیا، ماتھے کا پسینہ خشک کیا اور ہنس کر بولا ”میرے والد نے مجھے زندگی کی ڈائریکشن دے دی اور مَیں نے اولاد اور دولت کو صالح بنانا شروع کر دیا۔ مَیں نے اپنی دولت جمع کی‘ دس فیصد حصہ الگ کیا، یہ دس فیصد پراپرٹی میں لگایا، ایسے اثاثے بنائے جن کے کرایوں سے ہم اچھی اور پر آسائش زندگی گزار سکتے اور باقی دولت میں نے اللہ کے نام پر

وقف کر دی۔ مَیں نے ملک کے دور دراز علاقوں میں کنوئیں کھدوائے اور سکول اور ڈسپنسریاں بنانا شروع کر دیں۔ مَیں نے دولت کا ایک حصہ یتیم بچوں کی اعلیٰ تعلیم اور موذی امراض کے شکار لوگوں کی بہبود کے لیے بھی وقف کر دیا۔ یوں میری دولت صالح ہوتی چلی گئی۔ مَیں اب اپنے بچوں کو بھی ویلفیئر کے کام پر لگا کر صالح بناتا جا رہا ہوں' مجھے یقین ہے یہ بھی ایک دن میری قبر کے لیے ٹھنڈک بن جائیں گے۔

....وہ خاموش ہو گیا، مَیں نے پوچھا "آپ بچوں کو کیسے صالح بنا رہے ہیں؟" وہ مسکرایا اور بولا "میں بچوں کو ٹریننگ دے رہا ہوں' ہماری کامیابی ہمارا اثاثہ ہوتی ہے' ہم جب تک اس اثاثے کا ایک بڑا حصہ صدقہ نہیں کرتے ہم اس وقت تک صالح نہیں ہو سکتے۔ آپ انجینئر ہیں تو آپ اپنی انجینئرنگ کا ایک حصہ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے وقف کریں اور دوسرا حصہ صدقہ کر دیں' لوگوں کو اپنے علم اور اپنے فن کے فوائد میں شامل کر لیں آپ صالح ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو آپ لوگوں کا مفت علاج کریں' یہ مفت علاج آپ کی طرف سے صدقہ ہو گا اور یہ صدقہ آپ کو صالح بنا دے گا۔ اگر آپ تاجر ہیں تو اپنی تجارت کو منافع خوری' ملاوٹ اور بد دیانتی سے پاک کرتے جائیں آپ صالح تاجر ہو جائیں گے اور اس کا آپ اور آپ کے والدین کو فائدہ ہو گا"۔ وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا" آپ کو اب تک اس پریکٹس کا کیا فائدہ ہوا" وہ مسکرایا اور بولا "مَیں زندگی میں اور میرے والد موت کے بعد مطمئن ہیں' وہ اکثر اوورکوٹ پہن کر میرے خواب میں آتے ہیں' میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اونچی آواز میں کہتے ہیں شاباش عبدالمالک! اور مَیں نہال ہو جاتا ہوں، خوش ہو جاتا ہوں۔

بقیہ: علومِ اسلامیہ - دائرہ ہائے تحقیق

* مشترکہ عالمی مسائل کے حل میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک کی بنیادیں۔
* معاشی ترقی کی اسلامی حدود۔ * گلوبلائزیشن کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ۔
* حرمتِ سود کی حکمتیں۔ * سود کا جواز فراہم کرنے والے نظریات کا علمی و تنقیدی جائزہ۔
* غیر سودی معیشت کا تنقیدی جائزہ۔ * اسلامی بینکنگ اور فنانس کے مختلف پہلو۔
* اسلامی بنیادوں پر انشورنس کی تنظیم جدید

فہم دین

پروفیسر طارق بٹ

دانش وجرأت کا فقدان

عالمی ترجمان القرآن میں ڈاکٹر انیس احمد کے اداریے پر ایک نظر

ڈاکٹر انیس احمد صاحب ہمارے ملک کے معروف اسلامی دانشور ہیں۔ ہمارا حسن ظن تھا کہ وہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں پروفیسر رہے ہیں، تو وہ اصول فقہ میں استنباط نتائج اور منطقی استدلال کے ضوابط سے واقف ہوں گے مگر عالمی ترجمان القرآن جیسے وقیع جریدے کے مارچ کے شمارے میں انہوں نے جو اداریہ 'جمہوریت، مسلم دنیا اور تحریک اسلامی' کے عنوان سے لکھا ہے، اسے پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ جن لوگوں نے یہ اداریہ نہیں پڑھا وہ اسے ترجمان میں ایک نظر دیکھ لیں۔ ترجمان القرآن آن لائن بھی دستیاب ہے (www.tarjumanulquran.org)

محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس اداریے میں دو بنیادی باتیں کہی ہیں اور وہ دونوں صحیح ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے موقف کے حق میں مضبوط دلائل دیے ہیں اور انہیں موثر اور نپے تلے انداز میں بیان کیا ہے لیکن اس ساری جاندار بحث سے انہوں نے بہت پھسپھسے اور غیر متعلق نتائج نکالے ہیں اور اپنے سارے استدلال کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ان کی اس روش پر جو نرم سے نرم تبصرہ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ 'ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'۔

انہوں نے پہلی بات یہ کہی ہے کہ مغربی جمہوریت غیر اسلامی ہے، وہ اپنی بنیاد میں الحادی ہے اور مسلم معاشرے کے لیے موزوں اور قابل قبول نہیں۔ مزید یہ کہ پاکستانی جمہوریت کرپشن، دھاندلی اور سرمایہ داری پر مبنی ہے اور مغرب زدہ ومفاد پرست سیاسی طبقات کی لونڈی بنی ہوئی ہے اور اس کے ذریعے کسی تعمیری و اسلامی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے اور اگر وہ دانش اور جرأت سے کام لیتے تو وہ اس بیانیے سے وہ دو نتائج نکالتے جو منطقی طور پر اس سے نکلتے ہیں:

ایک یہ کہ جن دانشوروں، علماء کرام اور اسلامی سکالرز (بشمول مولانا مودودیؒ) نے

مغرب کی لادین، سرمایہ دارانہ اور سیکولر جمہوریت میں چند اسلامی اصولوں کی پیخ لگا کر اسے ''اسلامی جمہوریت'' کا نام دے کر قبول کر لیا اور اس کے ذریعے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی توقع باندھ لی، ان کا موقف (یا اجتہاد) غلط تھا، اور اب نتائج نے اسے عملاً غلط ثابت بھی کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے قائم کردہ تصورات اور اداروں کی اسلامائزیشن اصولاً ممکن ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا جو لوگ مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے پیدا کردہ اداروں اور اسلامی تصورات اور اداروں کی تلفیق اور پیوندکاری کے قائل ہیں، ان کا موقف غلط ہے۔ علماء کرام اور اسلامی سکالرز کو چاہیے کہ وہ مسلم معاشرے کے اجتماعی ڈھانچے اور اداروں کی بنیاد اسلامی تصورات پر رکھیں۔ جدید دینی تحریکیں پہلے فکری اور تحقیقی کام سے ان کی علمی صورت گری کریں اور پھر مسلم ریاستوں میں ان کے نفاذ کی جدوجہد کریں۔

دوسرا نتیجہ جو واضح طور پر ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں جس طرح کی جمہوریت رائج ہے اور جو مغربی جمہوریت کا ہی ایک بھونڈا اور کرپٹ مقامی ایڈیشن ہے (اور جسے 'اسلامی جمہوریت' کا جعلی اور خوبصورت نام دے دیا گیا ہے) اس کے ذریعے پاکستان میں اسلام نہیں آیا اور نہیں آ سکتا خصوصاً جب تک وسیع پیمانے پر اور گراس روٹ لیول پر تعلیم و تربیت، دعوت و اصلاح اور ابلاغ عامہ کے جدید وسائل کے ذریعے عوام کی اسلامی تربیت کر کے انہیں اسلامی مقاصد کے لیے عملاً متحرک نہیں کر دیا جاتا اور ان کی فعال اور موثر حمایت حاصل نہیں کر لی جاتی۔ اس کے بغیر موجودہ کرپٹ اور غیر اسلامی جمہوری نظام کے اندر رہ کر سیاسی جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں، اس سے اسلامی مقاصد حاصل نہیں کیے جا سکتے اور آج تک نہیں کیے جا سکے۔ لہٰذا جماعت اسلامی کو موجودہ مغربی جمہوریت اور پاکستانی جمہوریت میں بے سود اور لاحاصل سیاسی جدوجہد سے دست بردار ہو کر اسلامی نظام کے لیے متبادل حکمت عملی تیار کرنی چاہیے۔

دوسری بات جو محترم ڈاکٹر انیس صاحب نے اپنی تحریر میں کہی ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے لیے تعمیر اخلاق اور اصلاح فرد کا کام وسیع پیمانے پر تعلیم و تربیت کے ذریعے کرنے کی ضرورت ہے۔ مطلوبہ ذہن سازی اور تطہیر فکر میں ذرائع ابلاغ بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات بھی سو فیصد صحیح ہے لیکن اس کا جو نتیجہ ڈاکٹر صاحب کو نکالنا چاہیے تھا وہ

انھوں نے نہیں نکالا اور وہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کو اپنے افرادی اور مادی وسائل تعلیم وتربیت اور ذرائع ابلاغ پر لگانے چاہئیں۔ اِس وقت حالت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے لوگوں کی کئی یونیورسٹیاں، بیسیوں کالج اور سیکڑوں نہیں ہزاروں سکول ہیں لیکن یہ سارا تعلیمی نیٹ ورک نظریاتی سمت سے محروم ہے۔ اس کے چلانے والوں کے پیش نظر محض کاروبار، تجارت اور دینوی مفاد ہے اور دینی مقاصد نظروں سے اوجھل ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ جماعتی احباب کے یہ تعلیمی ادارے مغربی فکر وتہذیب اور اس کے اصول واقدار کے فروغ کا کام کر رہے ہیں (بشمول اس یونیورسٹی کے جس کے محترم ڈاکٹر انیس صاحب وائس چانسلر ہیں) لہٰذا جماعت اسلامی کی فوری اور بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام کے لیے تطہیرِ فکر اور تعمیر اخلاق کے عظیم مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے ارکان وکارکنان کے تعلیمی اداروں کے موجودہ مغرب زدہ تعلیمی منہج اور پروگراموں کو ختم کرنے اور انہیں اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے ہنگامی اقدامات کرے۔ اسی طرح جماعت کو اپنی دعوتی اور ابلاغی حکمت عملی بھی فوری طور پر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور اسے اپنے افرادی اور مادی وسائل کا رخ ذرائع ابلاغ کی اصلاح اور تعلیم اور میڈیا کے ماڈل اسلامی ادارے قائم کرنے کی طرف موڑنا چاہیے۔

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی بلکہ دکھ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب محترم نے اپنی تحریر سے نکلنے والے ان بدیہی نتائج میں سے کسی ایک پر بھی ایک لفظ نہیں کہا اور اسلامی نظام، نفاذ شریعت اور اسلام کے عدل اجتماعی کی برکات گنوانے کے بعد محض یہ کہہ کر فارغ ہو گئے کہ اسلامی تحریک کو ان حالات پر غور کرنا چاہیے۔

ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب محترم جیسا اسلامی سکالر بھی کھل کر اپنی فکر کے نتائج کو سامنے نہ لائے اور اس جماعت کو ان پر عمل کی دعوت نہ دے جس کے موقر جریدے میں وہ لکھ رہا ہے تو کسی اور سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنا تجزیہ دیانت دارانہ طور پر اور جرأت کے ساتھ جماعت کے سامنے رکھے گا تا کہ وہ اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرے اور روایتی سیاست میں مکھی پر مکھی نہ مارتی رہے کیونکہ صفر+صفر=صفر کا آخر فائدہ کیا ہے؟

فہم دین مدیر

’پیغام پاکستان‘۔حقیقت کیا ہے؟

اور علماء کرام کا موقف مخدوش کیوں ہے؟

ہم ابتداء ہی میں عرض کر دیں کہ ہمیں حکومت کی مجبوریوں کا علم بھی ہے اور علماء کرام کی مجبوریوں کا احساس بھی۔ اور ہم ’پیغام پاکستان‘ کی اس بنیادی تھیم سے اتفاق کرتے ہیں کہ کفار کی مدد لے کر پاکستان جیسی مسلم ریاست کے خلاف ’نفاذ شریعت‘ کے نام پر مسلح مزاحمت کرنا غلط ہے۔

پچھلے ماہ پروفیسر طارق بٹ صاحب نے ’پیغام پاکستان‘ کو ’آدھا سچ‘ کہا تو ہمیں بھی جستجو ہوئی اور ہم نے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ادارہ تحقیقات اسلامی کی ویب سائٹ سے ’پیغام پاکستان‘ نامی ۹۱ صفحات کے کتابچے کو ڈاؤن لوڈ کر کے اس کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بات اتنی سادہ نہیں جتنی بیان کی گئی ہے بلکہ پیچیدہ ہے اور ہم اسے سنجیدہ بلکہ گھمبیر اس لیے سمجھتے ہیں کہ اس کا تعلق فہم دین سے ہے اور ’دین‘ ہمارے لیے کوئی وقتی معاملہ (Phenomenon) نہیں مستقل اہمیت کی چیز ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی مسلم حکومت کفار کے دباؤ میں آ کر غلطیاں کرے، خلاف اسلام اقدامات کرے اور پھر مزید پڑنے والے دباؤ سے نکلنے کے لیے علماء سے یہ تقاضا کرے کہ جو غلطیاں اس نے کی ہیں، وہ اس کے لیے انہیں اسلامی چھتری مہیا کریں تو کیا علماء کرام کو زیب دیتا ہے کہ ایسی حکومت کے لیے دین کی ایسی تشریح کریں اور ایسے فتوے جاری کریں جن کی حکومت کو ضرورت ہو؟ ہماری رائے میں علماء کرام کو یہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے دین کی ہوا خیزی ہو گی بلکہ دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔

آج ۱۷ مارچ ۲۰۱۸ء کو جب ہم یہ سطور قلم بند کر رہے ہیں، فوج کے ترجمان نے کہا ہے کہ ہم نے ۷۵ ہزار افراد کی قربانی دی ہے اور ہمارا ۱۲۳ بلین ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔ ایک ہفتہ پیشتر وزیر خارجہ محمد آصف صاحب کا پارلیمنٹ میں دیا گیا بیان سارے اخبارات میں

شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے تسلیم کیا کہ مغرب اسلام اور مسلم دشمنی پر تلا ہوا ہے، ہم مسلمانوں نے پچھلے پندرہ سال سے اس کی حمایت کر کے غلطی کی ہے۔ سہولت کار کا کردار ادا کیا ہے اور اپنا حلیہ بگاڑ لیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب حکومت خود تسلیم کر رہی ہے کہ ماضی میں کیے گئے اس کے فیصلے غلط تھے تو پھر علماء کرام سے ان غلط فیصلوں کے حق میں فتویٰ لینے کی ضرورت کیا ہے؟ اور علماء کرام اس طرح کا فتویٰ دیں کیوں؟

پھر یہ سادہ لوحی بھی نا قابل یقین ہے کہ علماء کرام حکومتی موقف پر صاد کرتے ہوئے دوسرے پہلو اور موقف پر غور ہی نہ کریں! سوال یہ ہے کہ جو حکومت آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ آپ فتویٰ دیں کہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے مسلح جدو جہد جائز نہیں اور آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں تو آپ اس حکومت سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ بھائی! ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ پچھلے ستر سال سے اس بات پر کیوں مصر ہیں کہ آپ پاکستان میں شریعت نافذ نہیں کریں گے اور یہ کہ آپ پاکستان میں حکومت عملاً مغرب کی جمہوریت، لبرل ازم، سیکولر ازم اور نظام سرمایہ داری کے مطابق ہی چلائیں گے۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے ہتھیار اٹھانا واقعی شدت پسندی اور انتہا پسندی ہے اور ہم اس کی مذمت کرتے ہیں لیکن ۲۲ کروڑ عوام کی رائے اور متفقہ آئین کے برعکس اس ملک میں شریعت نافذ نہ کرنا کیوں انتہا پسندی نہیں؟ اور ہم اس کی مذمت کیوں نہ کریں؟

یہ حکومت اگر آپ سے فتویٰ مانگتی ہے کہ جو لوگ کفار کی مدد سے پاکستان کے خلاف دہشت گردی کی کاروائی کرتے ہیں ان کی حرکت غیر اسلامی ہے، اور آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں تو آپ اس حکومت سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ بھائی جن کفار نے ایک مسلمان ملک پر چڑھائی کی اور خود ہمارے علاقے میں ڈرون حملے کر کے قتل و غارت گری کی، کیا ان کا یہ فعل اسلامی تھا؟ اور آپ نے ان کفار کے دباؤ میں آ کر اپنے لوگوں کے خلاف آپریشن کیوں کیا؟ انہیں اور ان کے بچوں کو کیوں قتل کیا؟ ان کے گھر کیوں گرائے اور جلائے؟ انہیں ملک بدر کیوں کیا؟ اور انہیں کیوں مجبور کیا کہ وہ اندھے انتقام پر اتر آئیں اور کفار کی مدد لے کر آپ سے لڑنے مرنے پر تُل جائیں؟ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۸)

جدید ریاست

سید خالد جامعی[۱]

فراہمیٔ عدل و امن میں
جدیدیت اور جدید ریاست کی ناکامی

❊ انسانی حقوق کے نام پر عدالتی شفافیت کے ذریعے ہر مجرم تکنیکی اعتراضات پر بری ہوجاتا ہے لہٰذا ہر جدید ریاست کے پاس اس کا صرف ایک ہی حل ہے ماورائے عدالت قتل (Extra Judicial Killing) یا خاص عوامی، فوجی عدالتیں۔

❊ دنیا بھر کی ریاستیں امریکا وغیرہ سب ماورائے عدالت قتل پر مجبور ہیں۔ یہ ریاست کا اصل چہرہ ہے آئی جی سندھ اللہ ڈنو خواجہ بھی یہی فرما رہے ہیں کہ پولیس مقابلے کریمنل جوڈیشل سسٹم کی ناکامی کا منطقی نتیجہ ہیں۔

❊ وکیل فیصل صدیقی فرما رہے ہیں کہ اس مسئلے کا حل مجرموں کو طویل عرصے تک قید رکھنا ہے، ماورائے عدالت قتل نہیں ہے۔

❊ بادشاہ سیدھے سادے طریقے سے کسی مجرم یا بے گناہ کو پھانسی دیتا تھا تو اسے ظالم کہا جاتا تھا دنیا کی ہر جدید ریاست ہزاروں ماورائے عدالت قتل کرتی ہے تو یہ جمہوریت ہے مشکل کے حل کا تقاضا ہے۔

❊ فلپین کے صدر Duttret نے چار ہزار آدمی قتل کردیے جو منشیات بیچنے، خریدنے، پینے پلانے میں مصروف تھے پوری دنیا اور UNO خاموش ہے فلپین کی ترقی کے لیے یہ قتل جائز ہیں امریکا وہاں ڈرون حملے نہیں کررہا۔

❊ ہابس، جان لاک، کانٹ اور ہیگل نے ریاستی جبر کے ساتھ انسانوں کو غلام بنانے اور سفید فام نسل پرستی کے فلسفے پیش کیے ہابس نے Soverignity، لاک نے Property کانٹ نے Rational Capacity اور ہیگل نے Theory of History کے ذریعے دنیا کو کالونائز

---

[۱] دانشور، مصنف، جامعہ کراچی، فون 021-99261572

کرنے کا فلسفیانہ جواز مہیا کیا اور تشدد کی عقلی وکالت کی۔

پاکستان اور دنیا بھر میں ماورائے عدالت قتل نام نہاد انسانی حقوق کے تسلط کا نتیجہ ہیں۔ انسانی حقوق کے نام پر عدالتی طریقۂ کار میں شفافیت کے لیے ایسے مراحل آجاتے ہیں کہ مجرم چھوٹ جاتا ہے بڑا وکیل بری کرالیتا ہے ثابت شدہ ملزم بھی سزا سے بچ جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا حل صرف ایک ہے ماورائے عدالت قتل دنیا بھر میں یہی ہوتا ہے سندھ کے آئی جی بھی اس کے حامی ہیں دنیا کا دستور یہی ہے ہیومین رائٹس نے ہی یہ درندگی انسانیت، عدل کے نام پر پیدا کی ہے۔ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔

ڈان کی رپورٹ کے مطابق آئی جی سندھ نے فرمایا ہے کہ یہ بہت مشکل کام ہے کہ سندھ پولیس بیک وقت تین اُمور میں توازن قائم رکھ سکے وہ تین اُمور کیا ہیں مؤثر پولیس، قانون کا صحیح طریقے سے موثر استعمال اور عوام کی امیدوں پر پورا اترنا۔

(1) Effective Policing (2) Due Process of Law
(3) People's Expectations

اکیسویں صدی میں اربوں کھربوں روپے لے کر دنیا بھر کی ٹیکنالوجی اُدھار لے کر بھی پولیس، ریاست، ادارے کچھ نہیں کر سکتے۔ پاکستان میں ہر مرنے والے پولیس والے کو ایک کروڑ روپے نقد دیے جارہے ہیں مگر جرائم بڑھ رہے ہیں۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں [Security] تحفظ کے ادارے بڑھ رہے ہیں عدم تحفظ عام ہورہا ہے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں؟ اس پر ہم تفصیل سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ زینب قتل کیس سے متعلق مضامین دیکھیے۔

آئی جی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ پولیس مقابلے (Encounter) پولیس کی ناکامی ثابت نہیں کرتے بلکہ یہ مقابلے کریمنل عدالتی نظام کی ناکامی ثابت کرتے ہیں۔

Encounter shows failure of criminal justice system not of police [DAWN 18-2-2018]

چیف جسٹس ثاقب نثار فرماتے ہیں کہ عدالتی انصاف میں تاخیر کا سبب پولیس، پراسیکیوشن، گواہیاں، ایجنسیوں کا خراب کردار ہے۔ پولیس والے فرماتے ہیں یہ سب عدلیہ کا کیا دھرا ہے۔ ایک وکیل فیصل صدیقی فرماتے ہیں کہ مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔ مجرموں کو قید میں

رکھنا یعنی طویل عرصے تک مجرموں کی گرفتاری۔ پولیس مقابلوں اور ایجنسیوں کے ہاتھوں لوگوں کے غائب ہونے کا آسان حل یہی ہے۔

Long term detention could be an immediate solution of police encounter & enforced disappearance [DAWN 18-2-2018]

جدید ریاست کے جدید قوانین کے تحت بڑے بڑے مجرم بڑے وکیل کے ذریعے بچ جاتے ہیں انسانی حقوق کے نام پر عدالتی شفافیت کے ذریعے ہر مجرم تکنیکی اعتراضات پر بری ہوجاتا ہے لہٰذا ہر جدید ریاست کے پاس اس کا صرف ایک ہی حل ہے ماورائے عدالت قتل (Extra Judicial Killing) یا خاص عدالتیں۔ دنیا بھر کی ریاستیں امریکا وغیرہ سب ماورائے عدالت قتل پر مجبور ہیں۔ یہ ریاست کا اصل چہرہ ہے۔ بادشاہ سیدھے سادے طریقے سے کسی مجرم یا بے گناہ کو پھانسی دیتا تھا تو اسے ظالم کہا جاتا تھا۔ دنیا کی ہر جدید ریاست ہزاروں ماورائے عدالت قتل کرتی ہے وہ جمہوریت ہے، مشکل کے حل کا تقاضہ ہے۔

فلپین کے صدر Duttret نے چار ہزار آدمی قتل کردیے جو منشیات بیچنے، خریدنے، پینے پلانے میں مصروف تھے۔ پوری دنیا اور UNO خاموش ہے فلپین کی ترقی کے لیے یہ قتل جائز ہیں امریکا وہاں ڈرون حملے نہیں کررہا۔

تمام ترقی یافتہ تعلیم یافتہ معاشرے مجرمانہ معاشرے ہیں

دوسو سال کی تاریخ بتارہی ہے کہ ہر ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ ملک سب سے زیادہ مجرم پیدا کررہا ہے۔ جیسے جیسے تعلیم ترقی بڑھ رہی ہے جرائم بڑھ رہے ہیں۔ امریکی جیلوں میں سب سے زیادہ قیدی ہیں۔ سب سے زیادہ قاتل، جنسی درندے امریکا میں ہیں۔ دنیا کی جامعات میں پڑھائی جانے والی کتاب *Abnormal Psycology* پڑھ لیجیے جس میں مہذب ملکوں کے جرائم کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں سکنڈے نیوین ممالک بھی جرائم کا شکار ہیں۔ سویڈن جیسے عظیم فلاحی ملک میں بھی جرائم خودکشی عام بات ہے۔ جن معاشروں میں ریاست پیدائش سے موت تک فرد کی ہر ضرورت کی ذمہ دار ہے وہاں کا انسان مجرم کیوں ہے؟ جن ممالک میں زنا کاری کی عام اجازت ہے وہاں جبری زنا کاری کے سب سے زیادہ واقعات

کیوں ہورہے ہیں؟ یہ ہے اصل سوال!

جدید ریاست کا نظام عدل ماورائے عدالت قتل کا سبب ہے

جدید قانون کا اخلاق سے کوئی تعلق ہی نہیں وہ لا اخلاقی [Without Ethics] ہے وہ شفافیت [Transparency] کے نام پر مجرموں کو آزادی عطا کرتا ہے قانونی موشگافیوں کے ذریعے ہر بڑا مجرم بچ جاتا ہے پانامہ اسکینڈل میں صرف یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ نواز شریف سچ بول رہے ہیں یا جھوٹ عدالت کو ایک سال لگ گیا۔ یہ ہے جدید قانون اور جدید عدالت ایک بات معلوم کرنے کے لیے اربوں روپے خرچ ہوگئے۔

جدید قانون کی یہی نحوست ہے جو ظلم و جبر عام کرتی اور عدل ناممکن بناتی ہے۔ جب DPR، ایمرجنسی مارشل لاء یا کسی بھی قانون کے تحت کسی ناپسندیدہ فرد کو طویل عرصے کے لیے قید کردیا جاتا تھا تو سول سوسائٹی شور مچاتی تھی انسانی حقوق پامال ہورہے ہیں رہا کرو۔ لہٰذا ریاست اور ایجنسیوں نے جنھوں نے خود ہیومین رائٹس کا کھیل تسلیم کیا، مسئلے کا حل یہ نکالا کہ مقابلے میں قتل کردو یا بدمعاشوں کو غائب کرادو۔ ریاست جانتی ہے کہ بڑے بڑے مجرم قانون کی گرفت میں کبھی نہیں آسکتے۔ لیکن بادشاہ اپنے کسی مخالف یا دشمن یا مجرم کو یا تو قید میں رکھتا، سزا دیتا یا قتل کرادیتا۔ مجرم ملزم بے گناہ سب کی قسمت کا صحیح یا غلط فیصلہ سب لوگوں کے سامنے آجاتا تھا مگر یہ ظلم تھا جدید ریاست عدالتی کاروائی سے گریز اور بدنامی سے بچنے کے لیے لوگوں کو خاموشی سے اُٹھا لیتی، غائب کرادیتی یا قتل کرکے پھینک دیتی ہے بادشاہت کا نظام بہت برا تھا کم از کم بادشاہت کے دور میں لوگوں کو پتہ چل جاتا تھا کہ کسے قید کیا گیا ہے وہ کہاں بند ہے وہ مجرم ہے یا بے گناہ ہے اس کے گھر والے جانتے تھے کہ ان کا عزیز کہاں ہے کیا کررہا ہے وہ جدید ریاست کے انسان کی طرح اپنے رشتہ داروں کے لیے روز جیتے اور روز مرتے نہیں تھے کہ ان کا عزیز کہاں ہے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا عورت غائب ہو تو شوہر، بچے غائب ہوں تو باپ اور عاقلہ غائب فرد کے لیے آنکھوں میں راتیں نہیں کاٹتے تھے مگر آج سب بادشاہت کو گالیاں دیتے ہیں جمہوریت کے قصیدے پڑھتے ہیں جمہوریت اور انسانی حقوق میں یہی کرنا پڑتا ہے۔ ریاست کو اپنا چہرہ چھپانے کے لیے دنیا بھر میں یہی کام

کرنے پڑتے ہیں یہ چہرہ ریاست کی مجبوری ہے۔ یہ نام نہاد انسانیت جمہوریت، انسانی حقوق، شفاف عدل، آزاد عدلیہ کی قیمت ہے جو دنیا کی ہر قوم روز چکا رہی ہے۔

لبرل سیکولر عاصمہ جہانگیر جیسے لوگ جنھوں نے زندگی میں کبھی روسو، ہابس، کانٹ، لاک، ہیگل کو نہیں پڑھا لہٰذا جدیدیت جدید ریاست کی وحشت، بہیمیت، درندگی سے کبھی واقف ہی نہیں ہو سکتے۔ کانٹ نے سفید فام اقوام کی Rational Capacity کی بنیاد پر انھیں دنیا کی تمام قوموں سے برتر [Superior] قرار دیا وہ سفید فام نسل پرستی کا سب سے بڑا فلسفی ہے۔ اس کا فلسفہ حیاتیاتی نسل پرستی کا فلسفہ ہے دنیا اسے عظیم فلسفی تسلیم کرتی ہے جو اتنا متعصب اور انسان دشمن تھا۔

انسانی حقوق کا منشور دینے والے مغرب کی دہشت گردی کی تاریخ کیا ہے؟

جدید ریاستوں میں انسان کتے بلی کی طرح مارے جاتے ہیں اب یہی وکیل جو جدید ریاست کے فقیہہ ہیں کہہ رہے ہیں کہ نہ مارو نہ غائب کرو بس انھیں بند کر دو ایوب خان یہی تو کرتا تھا تو لوگ اس کے خلاف کیوں تھے؟ جس ریاست میں انسانی حقوق آ جاتے ہیں وہاں انسان کتوں کی طرح مارے جاتے ہیں امریکا میں بلیک پینتھر موومنٹ کا انجام اس کا ثبوت ہے۔ دنیا بھر میں جمہوریت، انسانی حقوق نافذ ہونے کے بعد کتنے قتل عام ہوئے وہ پڑھ لیجیے انسانوں کو کتے بلیوں کی طرح ہلاک کیا گیا یہ مغرب کی تاریخ ہے یہ محض دعویٰ نہیں ہے ہم اس کی دلیل بھی پیش کرتے ہیں۔

Global Politics کا مصنف لکھتا ہے کہ مغرب کی پانچ صدیوں کی خوں ریز تاریخ میں سے انیسویں اور بیسویں گزشتہ دو صدیوں میں سب سے زیادہ جنگیں لڑی گئی ہیں ہم تاریخ انسانی کے بدترین دور میں رہ رہے ہیں یہ دور۔ جدیدیت (ماڈرن ازم) کا پیدا کردہ دور ہے جو نہایت سفاک، درندہ صفت اور وحشی ہے۔

It has been suggested that since 3600 B.C., there have been only 292 years without war, and each decade since 1816 has averaged twenty-two wars. It is estimated that more than 150 million people have died from war-related deaths since

3000 B.C.

"Each of the centuries prior to the sixteenth accounted for less than 1 percent of all war deaths. In fact all of them added together accounted for little more than 4 percent of these deaths, while almost 96 percent of war deaths were estimated to occur in the modern period of history, 1500-2000."Seventy-three percent of all war-related deaths since 3000 B.C. have occurred in the twentieth century A.D." Civilian deaths have been a large part of the increase in war deaths. According to UN Secretary General Kofi Annan, "UN sources estimate that at least three-quarters of the casualties of recent conflicts have been civilians, though the precise numbers are not known. " Over half of the civilians, though war victims of the past decade have been children, including two million dead and six million physically disabled since 1990.

Most of the war throughout history have occurred in the past two centuries. perhaps more disturbing.

from the point of global security, it is a shocking fact... that in some ways we are living through one of the worst decades in modern history. The 1970s were the decade with the most war onsets of all types. This was not an insolated spike, as 1960s and 1980s were also worse decades than average. And while the data for the 1990s are not complete, the 1990s will likely win the dubious distinction of being one of the two most war-prone decades [along with the 1970s] since the Congress of Vienna.

Juliet Kaarbo . -James Lee Ray Global Politics, Wadsworth publishing 10 edition (Febuary 2010)chap 5 International Confilct p.162,163]

منشورِ انسانی حقوق میں مساوات کا عقیدہ ہے تو قومی سرحدیں کیوں ہیں؟

کوئی لبرل، سیکولر، ملحد، مفکر ہمارے دعوے کی دلیل کو رد نہیں کرسکتا مغرب انسانیت اور انسانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے اس نے تاریخ انسانی میں جتنے قتل عام کیے اتنے قتل تمام تہذیبوں نے مل کر بھی نہیں کیے۔ انسانی حقوق کے منشور میں تمام انسان برابر ہیں مساوات ہے لیکن قومی سرحدیں کیوں قائم ہیں اگر سب برابر ہیں تو قومی سرحدیں ختم کردی جائیں؟ ہر شخص کو ہر ملک میں آنے دیا جائے خلافت اسلامیہ میں ویزہ تھا نہ پاسپورٹ یہودی اندلس سے نکالے گئے تو خلافت عثمانیہ کے مرکز استنبول میں آباد ہوئے۔ جپسی (Gipsy) کرغیزی، برمی، بہاری، فلسطینی، برازیل اور کینیڈا کے حقیقی باشندے (indigenous) دنیا بھر میں گھر اور زمین کی تلاش میں ہیں یا اپنے ہی وطن میں اجنبی بنا دیے گئے ہیں۔ قومی ریاست اور انسانی حقوق نے ان لوگوں کی نقل مکانی پر ان کی نشو و نما پر پابندی لگا دی ہے قومی ریاستوں سے پہلے دنیا میں لوگ ہر جگہ بغیر پاسپورٹ ویزا کے آسانی سے آجا سکتے تھے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے رہتے تھے مگر اب یہ کہاں جائیں؟

تمام براعظم اس انسانی المیے سے دوچار ہیں ہر شخص کا فطری گھر قومی ریاست نے تباہ کردیا ہے۔ قومی ریاست کی وجہ سے ہر جگہ تشدد و نقل مکانی ہے *The Clash of Civilizations* کا باب دس گیارہ پڑھ لیجیے۔ مائیکل مین کی کتاب *The Dark Side of Democracy* دیکھ لیجیے۔

تاریخ انسانی کا المیہ یہ ہے کہ اگر آپ امیر ہیں تو آپ کے لیے تمام قومی سرحدیں کھلی ہوئی ہیں آپ امیر ہیں تو امریکا سمیت دنیا کے کسی بھی ملک کی شہریت چوبیس گھنٹے میں خرید سکتے ہیں تفصیلات کے لیے سانڈل کی کتاب Justice پڑھیے۔ انٹرنیٹ پر ہر ملک کی شہریت کی قیمت پڑھ لیجیے۔ آزادی اور مساوات کا مطلب ہے آپ کتنے امیر ہیں آپ کے لیے ہر ملک کی سرحد کھلی ہے ہر ملک امیر کا استقبال کرے گا غریب کو کہے گا تم دوسری قوم کے آدمی ہو اصل قوم صرف ایک ہے امیر لوگوں کی قوم یہ سب مساوی ہیں۔

کالونیل ازم کی بنیاد ہابس لاک کانٹ ہیگل کے فلسفے نے مہیا کی

کانٹ نے گوری اقوام کی برتری حیاتیاتی نسل پرستی کا فلسفہ پیش کیا دنیا بھر میں استعماریت نوآبادیاتی نظام کالونیل ازم کی چار فلسفیانہ تعبیرات پیش کی گئیں ۔ ہابس نے Soverienity، جان لاک نے Property کانٹ نے Rational Capacity، ہیگل نے Theory of history کے ذریعے ترقی اور اقوام عالم کو غلام بنانے کا علمی وعملی جواز مہیا کیا۔

ان مفکروں نے بتایا کہ حاکمیت ، اقتدار اعلیٰ کا تصور مغرب نے دیا ہم Soverign ہیں لہٰذا دنیا کو غلام بنا سکتے ہیں کیوں کہ دنیا اندھیرے میں ہے عقلیت سے عاری ہے اس کی اصلاح اسی طریقے سے ممکن ہے۔ سرخ ہندیوں کو جان لاک کے فلسفہ ملکیت کے ذریعے قتل کیا گیا اور غلام بنایا گیا کیوں کہ ان کی زمین خالی (Empty) تھی بارآور (Productive) نہیں تھی یہ زمین میں محنت کرکے اس سے املاک، اموال، اجناس، غلّہ پیدا کرنے کے قائل نہیں تھے وہ فطرت کی زندگی بسر کرتے تھے لہٰذا انسان نہیں تھے جانور تھے۔ سفید اقوام انھیں غلام بنا کر انھیں قتل کرکے ان سے بے کار زمین چھین کر اسے پیداوار کے قابل (Productive) بنا رہی تھیں ۔ یہ غلام زمین کو پیداوار کے قابل بنانے کے عمل میں سفید فام اقوام سے لڑنے آگئے یعنی حالت فطرت [State of Nature] سے یہ سرخ ہندی حالت جنگ [State of war] میں آگئے لہٰذا ان کو قتل کرنا اور غلام بنانا سفید اقوام کی مجبوری تھی تا کہ یہ انسان بن جائیں جب ان کو غلام بنالیا گیا ان کو مزدور (Labour) بنالیا گیا تو یہ سرمایہ کے کارندے (Labour Capital) ہو گئے انسان بن گئے، سرمایہ کے مزدور بن گئے Productive ہو گئے فائدہ بخش انسان بن گئے اب یہ انسان کہلانے کے مستحق ہوئے ۔یعنی اب ان کو قتل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ سرمایہ داری کے دائرے میں آگئے ان سے انسانوں جیسا سلوک کیا جائے گا۔

ہیگل عیسائی مذہب کی بہت قدر کرتا تھا کیوں کہ عیسائیت کے عقیدے نے انسان کو خدائی کے مقام پر فائز کیا تھا دوسرے معنوں میں جدیدیت نے خدا مرکز کائنات سے خدا کو خارج کرکے خدا کا انکار نہیں کیا بلکہ اس خالی جگہ کو دوسرے خدا انسان سے پر کردیا، انھی معنوں

میں بعض مفکرین جدیدیت اور عیسائیت میں مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہیگل نے کہا کہ یورپ میں سب لوگ آزاد ہیں یورپ میں روح [Spirit] تاریخ ہے امریکا مستقبل میں آزادی کے فلسفے اور فکر کا حقیقی نمائندہ ملک ہے آزادی ہی ترقی کا استعارہ ہے ہر آنے والا دور پچھلے دور سے بہتر دور ہے۔ افریقا کی کوئی تاریخ نہیں وہاں روح ابھی تک فطرت ہے آزاد شعور موجود نہیں ہندوستان میں بس بادشاہ آزاد ہے باقی سب محروم۔ ہند کی تاریخ Unhistoric history ہے۔

افریقا تاریخ کے دھارے میں شامل ہی نہیں لہٰذا افریقیوں کو غلام بنانا ضروری ہے کہ یہ آزادی کی روح کے خلاف عمل کررہے ہیں جب یہ غلام بن جائیں گے تو انھیں شعور آزادی حاصل ہوگا پھر یہ آزادی کی جدوجہد کریں گے لہٰذا افریقیوں کو آزادی دینے کے لیے ہیگل کے فلسفے کے تحت غلام بنایا گیا۔

قدیم فلسفے اور تاریخ کی عقلیت اور جدید مغرب کی عقلیت کا بنیادی فرق کیا ہے؟

انسان کسی مقصد کا ذریعہ نہیں ہے مگر اب وہ صرف سرمایہ کے مقصد کا ذریعہ ہے۔ کانٹ نے کہا کہ Rational Capacity سے مراد وہ عقلی صلاحیت نہیں ہے جو فطرت، قدرت سے عطا ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ ملکہ ہے جو انسان اپنی صلاحیت سے حاصل کرے۔ تاریخ انسانی میں یہ ملکہ صرف یورپی سفید فام اقوام نے حاصل کیا افریقا اور دوسرے خطوں کے لوگ اس لیے انسان نہیں ہیں کہ ان کے پاس فطرت کا عطا کردہ عقلی ملکہ تو ہے مگر خود محنت سے حاصل کردہ ملکہ نہیں لہٰذا یہ انسان نہیں انھیں غلام بنایا جاسکتا ہے۔ ہیگل، کانٹ اور دیگر فلاسفہ کے یہاں ماضی کی عقلیت عقلیت کے جدید معیار پر پوری نہیں اترتی یہ عقلیت نہیں محض استغراق تھا یا آوارگی کیوں کہ اس عقلیت سے ترقی، فطرت کا مطالعہ کرنا فطرت کو مسخر کرنا اور فطرت دشمنی کرنا ممکن نہیں دوسرے معنوں میں سترھویں صدی سے پہلے کی عقلیت، تدبر، تفکر سے ترقی ممکن نہیں۔

مغربی اصطلاح میں ترقی کا مطلب فطرت کو تباہ کرنا، اس کا استحصال کرنا، اس کو مسخ اور برباد (Destruct) کرنا ہے اس لیے تمام سائنس دان مطالبہ کررہے ہیں کہ ترقی کی رفتار،

چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں، آلودگی کو کم کیا جائے ورنہ یہ دنیا تباہ ہوجائے گی پہلی مرتبہ سائنس دانوں کا اجماع ہوا ہے کہ ترقی روک دو جب کہ سائنس کی تاریخ میں کبھی اجماع نہیں ہوتا۔ کیوں کہ سائنس میں ہر شے غیر مطلق ہے مگر اس کے باوجود سائنس دانوں کا اجماع ہوگیا ہے۔ تفصیلات کے لیے الگورے کی کتاب پڑھ لیجیے۔

جدید فلسفہ مغرب میں Reason سے مراد یونانیوں کی عقلیت نہیں ہے کلاسیکی فکر کی روح خرد پرستی ہے جس کے مطابق صرف معقول ہی حقیقی ہے اور معقول تصوراتی [Idea] ہے لہٰذا اختباری [Experimental] غیر حقیقی ہے۔ کانٹ اپنے مضمون What is Enlightenment میں عقلیت کی تعریف میں لکھتا ہے کہ روشن خیالی وہ دور جب انسان اپنی عقل کسی مقتدرہ، خارجی ذریعے اور کسی کی رہنمائی کے بغیر خود استعمال کرنے کے قابل ہوگیا دوسرے معنوں میں انسان ہدایت، رہنمائی، رہبری کے لیے کسی کا محتاج نہیں رہا اس کو روشنی کے لیے اپنے سے باہر آسمان وحی اور نبی کی طرف نہیں صرف اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت تھی۔ انسان کی اس خود مختاری، خود کفالت کا نام روشن خیالی ہے۔

Enlightenment is the movement when hmmunity is going to put its own reason to use, without subjecting itself to any Authority.

فوکالٹ Cult of Reason کی تشریح کرتے ہوئے اپنے مضمون What is Enlightnment? میں تحریک روشن خیالی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اس تحریک کا دور حقیقت میں تنقید کا دور ہے ہر چیز پر تنقید روشن خیالی کا عقیدہ ہے۔

The Critique is, in a sence, the hand book of reason that has grown up in enlightenment and conversely, the Enlightenment is the age of the Critique.

صرف سفید فام اقوام انسان کہلانے کی مستحق ہیں

کانٹ نے بتایا کہ انسان وہ ہے جو اپنے نفس کے ارادے (Internal Order) کو فطرت پر، کائنات پر مسلط کردے وہ لوگ جو فطرت کے ساتھ چل رہے ہیں وہ انسان نہیں انسانیت کے دائرے سے باہر ہیں۔ لہٰذا کانٹ لکھتا ہے کہ عقلیت کی کمی انسانیت کی کمی ہے اور

انسانیت کی کمی عزت نفس کی کمی [Lack of Rationality Lack of humanity] [Lack of Dignity] کے سوا کچھ نہیں۔

دوسرے معنوں میں یہ تمام خواص صفات صرف اور صرف سفید فام اقوام کے پاس ہیں دنیا ان اوصاف سے عاری ہے۔

کانٹ نے اپنے فلسفے کے تحت سفید فام نسل پرستی یعنی حیاتیاتی نسل پرستی (Biological Rasicm) کا فلسفہ پیش کیا آج اسی کانٹ کو آزادی کا علمبردار سمجھا جا رہا ہے جس نے تمام انسانیت کو غلام بنانے کا فلسفہ پیش کیا جس نے دعویٰ کیا تھا کہ انسان خود مقصود بالذات (End in himself) ہے کیوں کہ انسان کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں Meant to an end۔

کانٹ نے اپنی انسان مرکز فکر (Anthropocentric Approach) کی تشریح میں یہی بات لکھی ہے۔

So act that you use humanity, whether in your own person, or in the person of any other, always at the same time as an end, never merely as a means. [Kant. Metaphysics of Morals New York, Cosimolnc 2007 : P. 185]

کانٹ نے بتادیا کہ انسان خودمختار، فاعل مطلق، قائم بالذات (Self determind) ہے خود مقصد (End in himself) ہے کسی دوسرے مقصد کا ذریعہ Mean to an end نہیں ہے۔

لیکن آج انسان اور اس کی عقلیت صرف سرمایہ اور لذت کے حصول کے لیے کام کر رہی ہے انسان خود مقصد نہیں رہا وہ دوسرے مقصد کا ذریعہ بن گیا۔ تمام اقوام ترقی برائے ترقی سرمایہ برائے ارتکاز سرمایہ کے لیے کام کر رہی ہیں ۔ سرمایہ قوموں کا غلام نہیں قومیں، عوام سرمایہ کے غلام بن چکے ہیں سفید زرد اقوام کی شرح پیدائش منفی ہوگئی ہے وہ ترقی سرمایہ میں آگے ہیں لیکن ان کی نسل مٹ رہی ہے جب نسل ہی نہیں ہوگی تو اس ترقی اور سرمائے کا کیا فائدہ؟ (جاری ہے۔)

لبرل ازم

حامد کمال الدین[۱]

لبرل ازم کے مسلم علم برداروں کے طرزِ فکر اور طریق واردات کی تفہیم ضروری ہے

لبرل ازم، الحاد اور اسلام

لبرل ازم کی تفہیم کے لیے صرف کتابی علم کافی نہیں

سماجی تحریکوں کے معاملہ میں 'انسائیکلو پیڈیائی معلومات' ایک حد تک ہی مفید ہیں۔ ایک چیز اگر نری فکر ہے پھر تو حرج نہیں کہ اس سے متعلق کچھ کتابی اشیاء ہی آپ کا بڑا سہارا ہوں۔ بریٹانیکا وغیرہ میں جو لکھا ہے اغلباً وہی اس کی حقیقت ہوگی۔ اس کے تاریخی یا فلسفی حوالے اس صورت میں آپ کو بسہولت کفایت کریں گے۔ تاہم جیسے ہی وہ فکر ایک تحریک یا مسلک میں ڈھلے گی 'کتاب' اور 'واقع' کے مابین فرق آنے لگے گا، جو وقت گزرنے اور حالات بدلنے کے ساتھ، خصوصاً اس تحریک کو درپیش نئے میدان اور نئے حریف سامنے آنے کے ساتھ، بڑھنے اور پیچیدہ ہونے کی صلاحیت رکھے گا۔

اس قاعدے سے اگر کسی کو استثناء مل سکتی تو وہ ہماری اسلامی تحریکیں تھیں جن کا مرجع ''قرآن مجید'' ایک نہایت محکم دستاویز ہے اور جس سے اِن کی وابستگی کا یہ عالم کہ اس کے زیر زبر تک سے استدلال ہوتا ہے اور ایک ایک حرف میں اس کی پابندی۔ اس کے باوجود ہم کسی اسلامی تحریک یا مسلک کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے کے لیے صرف ''قرآن'' سے رجوع نہیں کرتے! بلکہ اس کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ خود اس جماعت کی سوچ اور عمل کا ہی کچھ تجزیہ کریں۔ پھر اگر اس کے وجود پر ایک زمانہ بیت گیا ہو تو اس پر قدیم میں ہو چکی باتوں پر بھی اکتفا نہ کریں بلکہ اس میں رونما تبدیلیوں (developments) کا الگ سے ایک جائزہ لیں۔ کوئی کہے کہ ایک جماعت اپنا تمام ولولہ (inspiration) یا دلیل (evidence) جب قرآن سے لیتی ہے تو پھر قرآن ہی کو چیک کر لو اور اس سے جو جو کچھ ثابت ہو، وہی خود بخود اُس جماعت کا نظریہ اور طرزِ عمل ہوگا.. تو ظاہر ہے آپ اس سے اتفاق نہیں کریں گے! وجہ وہی۔ ایک انسانی ٹولہ محض کسی عبارت یا متن کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک نامیاتی مخلوق ہے جس پر

[۱] دانشور، مصنف، داعی، لاہور، matbooateeqaz@gmail.com

موسم، حالات، آب و ہوا، سب چیزیں اثر کرتی ہیں۔ خصوصاً اگر آپ اُسے ایک سرد برفانی خطے سے اٹھا ایک شدید گرم استوائی خطے میں 'ٹرانس پلانٹ' کر رہے ہوں، یا اس کے برعکس، پھر تو وہ بے پناہ تبدیلیوں سے گزرتی اور اپنا پھل دینے میں قابل لحاظ حد تک مختلف ہو سکتی ہے۔ پیوند (grafting) اور تقلّب (mutation) ایسے واقعات الگ، جو تحریکوں اور مسلکوں میں غیر محسوس رہتے مگر تسلسل سے چلتے ہیں۔

چنانچہ قرآن ایسی ایک محکم (تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ) کتاب کو اپنا ریفرنس ماننے والی انسانی جماعتوں کی بابت اگر یہ ضروری ہے کہ ان کے ریفرنس سے ہٹ کر بھی کچھ ان کے فکر و عمل کا جائزہ لیا جائے... تو وہ سماجی تحریکیں تو بالاولیٰ اس کی ضرورتمند ہوئیں جو اپنے عقیدہ و عمل کے لیے کوئی ایسی مخصوص کتاب (a specific text book) ہی سرے سے پاس نہیں رکھتیں۔

لبرلز کے متعلق مزید یہ کہ ہمارے ماحول میں یہ اپنی کچھ ایسی نمائندہ قیادتیں بھی نہیں رکھتے جو ان کے مواقف پر با قاعدہ حوالہ ہوں۔ جس سے، سننے پڑھنے والے کم از کم اس روشنی میں آ جائیں کہ لبرلزم کا مُدعا بس اس پوائنٹ سے اس پوائنٹ تک ہے، اس کے ماسوا اگر کوئی بات ہے تو اس کا ذمہ دار ہرگز ہرگز لبرلزم نہیں بلکہ اس کے ذمہ دار کچھ اور ہوں گے (مانند لبرٹینزم [libertinism]، یا ہوموسیکسویلٹی [homosexuality]، یا ایتھزم [atheism] یا اگناسٹزم [agnosticism] وغیرہ) جن سے لبرلز کا کچھ لینا دینا نہیں۔ اس کے برعکس، متعدد لوگ یا پھر ادارے خصوصاً این جی اوز یہاں 'حسبِ توفیق' لبرلزم کی خدمت کر رہے ہیں۔ البتہ لبرلزم ایک با قاعدہ دعوت کے طور پر یہاں اپنا راستہ بناتا اور ایک 'بیانیہ' چھاپتا آ رہا ہے۔ اس تحریک سے وابستہ سبھی ذہن ظاہر ہے ایک سی سطح یا پس منظر کے نہیں۔ دین سے دوری میں بھی یہ سب یکساں نہیں۔ نتیجتاً: پبلک میں لبرلزم کی تعبیر کے حوالے سے کچھ الجھاؤ پائے جاتے ہیں۔ گو اس کے فوائد بھی ہیں جن میں سے ایک: 'کیموفلاجنگ' (camouflaging) یعنی وقت اور موقع کی رعایت سے جس چیز کو چاہو اون (own) کرو اور جس چیز سے چاہو لاتعلقی کر دو، یہاں تک کہ ایک مذہبی طبقے کو اپنا گاہک بنا رکھو!

مزید برآں، ہمارے ملک میں اس وقت جو لبرل تحریک ہے وہ اپنی اَفرادی قوت کے

لحاظ سے کوئی یکدم وارد نہیں ہوئی ہے۔ اس کے بہت سے اجزاء کل کے 'ترقی پسندوں' پر ہی مشتمل ہیں۔ خدا کا کرنا، وہ مشرقی 'پرولتاریہ' ہی اب مغربی 'بورژوازی' کے فکر اور ایجنڈا میں سچائیاں دیکھنے لگی! ایک ہی تحریک میں رخ کی یہ حیرت انگیز تبدیلی جس ایک چیز کی مرہونِ منت ہے وہ یہ کہ 'مدمقابل' کل بھی اسلام تھا اور آج بھی اسلام۔ پس اس لحاظ سے بھی، لبرلزم کی 'کتابی' تعریفات اِس تحریک کے تجزیہ ومطالعہ میں ایک حد تک ہی قابل غور ہونی چاہئیں۔ اس لیے کہ اِس کا کُل محرک وہ کتابی اشیاء تھیں نہیں۔ نہ کل اور نہ آج۔

ایک اور الجھن اس میں یہاں سے آ جاتی ہے کہ ایک بڑی سطح پر ہیومنسٹ (humanist) شجر سے وابستہ کئی بدیسی افکار پاکستان کے سماجی فیبرک پر بیک وقت حملہ آور ہیں اور اپنی اس پیش قدمی میں باہم متعاون بھی۔ کہیں سیکولرزم (secularism)، تو کہیں اباحیت پسندی (libertinism)، تو کہیں تقاربِ ادیان (religious rapproachment) تو کہیں اگناسٹسزم (agnositicism) تو کہیں ایتھزم (atheism) تو کہیں گے۔ ازم (gay-ism) تو کہیں کوئی اور 'ازم'۔ بے شک ان تحریکوں سے منسلک 'افراد' سوچ کے الگ الگ زاویے بھی رکھتے ہوں.. تاہم 'ایجنڈا' کی سطح پر، دیکھنے والے کو یہ ایک تقسیمِ کار (division of work) زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ یہاں سے؛ گھر کے ایک محافظ کی بنیادی فکرمندی (main concern) یہ نہیں رہتی کہ یہ کچھ باہم متعاون حملہ آور جتھوں کے شیڈز اور کلرز ذہن نشین کرے بلکہ اِس کی زیادہ توجہ اُس یکجا حملے کو رد کرنے کی طرف ہو جاتی ہے؛ اور یہ اُن سب کو ایک مشترکہ خطرے کے طور پر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ... یہ محض ایک فکری اور تہذیبی جنجال ہی نہیں رہتا بلکہ ایک سطح پہ جا کر یہ ایک سنگین قومی حساسیت بھی اختیار کرتا ہے۔ مثلاً آپ غور فرمائیں تو اہلیانِ پاکستان کا ایک معتد بہ طبقہ ''لبرل'' کی پہچان آج اس بات سے کرنے لگ گیا ہے کہ یہ پاکستان میں بھارت کی بولی بولنے والوں کو کہا جاتا ہے یا بلوچ علیحدگی پسندوں کے لیے بڑے تخلیقی انداز سے ایک ہمدردی پیدا کرنے والوں پر بولا جاتا ہے! ظاہر ہے 'لبرلزم' کی تعریف اور مفہوم سے اس چیز کو کچھ علاقہ نہیں، لیکن بات اگر 'ایجنڈا' کی سطح پر دیکھنے کی ہو تو تب یہ اتنی غیر متعلقہ بھی نہیں۔ جبکہ 'تحریکوں' میں یہ سب چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ لبرلزم کو حالیہ برسوں کے دوران پاکستانی سماج کی زمین پر پیش قدمی کرتا دیکھنا نرا ایک انسائیکلوپیڈیائی حوالہ ہی نہیں رکھتا۔ گو ہمارا یہ مقصد نہیں کہ یہ تاریخی یا نصابی حوالے مسئلے کو دیکھنے کی کوئی جہت نہیں۔ بہت سے فاضل اصحاب، لبرلزم پر اس اکادمی (academic) پہلو سے لکھ بھی رہے ہیں۔ وہ تحریرات اپنی جگہ یقیناً اہم ہیں۔ ہم جس زاویے سے اس کو لیں گے اس پر کچھ بات ہو چکی اور ایک چیز اختصار سے ابھی ہم بیان کریں گے:

انسانی نفس اور سماج میں اسلام کو مطلوب جو ایک تصویر ہے، اس پر روزِ اول سے بڑے بے رحم حملے ہوتے آئے ہیں۔ مگر یہ زمین پر آسمان کی امانت، برابر سر اٹھائے رہی۔ اِس پر فدا ہونے والے، ہر دور میں کھڑے نہ ہوتے تو اسلام کی یہ تصویر بدل کر کچھ سے کچھ ہو چکی ہوتی۔ پس خود یہ تصویر تو ایک غیر متبدل حقیقت ہے، البتہ اس پر حملہ آور روز ایک نئے رنگ سے آتے ہیں۔ اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں یہ امت اتنے 'ازم' بھگتا چکی کہ شمار سے باہر ہے۔ ہر چند سال بعد یہاں ایک نیا 'ازم' وارد ہوتا ہے جو اپنے جوش میں اس کو بدل کر جانے کیا سے کیا کر دے گا مگر تھوڑے سال بعد وہ لائبریری کے کسی شیلف میں پڑا استا رہا ہوتا ہے۔ (خود اپنی زندگی میں ہم ایسے کتنے 'ازم' ٹھکانے لگتے دیکھ چکے)۔ اسلام کی یہ مطلوبہ تصویر جسے ان شاء اللہ قیامت تک رہنا ہے، اپنی اساس میں چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ماخوذ ہے، تو اس پہلو سے اس کا نام ''سنت'' ہے۔ جبکہ اپنے تسلسل میں یہ انسانوں کا ایک ہم آہنگ گروہ جس پر براعظموں کے فاصلے مٹ جاتے اور رنگ و نسل کے فرق محو ہو جاتے ہیں اور یہ روئے زمین پر شرق تا غرب ایک ہی آسمانی حقیقت کا بیان ہوتا ہے، جو تہذیب کے ہر رنگ اور ہر زبان میں بولتا اور مخلوق کو اس کے خالق کی یاد دلاتا ہے۔ اِس پہلو سے اِس کا نام ''جماعت'' ہے۔ یعنی سماج جو آسمان سے ہدایت لے(The Heavenly Community on Earth)۔
اِس ''سنت و جماعت'' کے محافظ طبقے جو ہر دور کے 'اِزموں' سے نمٹتے ہیں، اپنی بنیادوں کے تحفظ میں کچھ قاعدے، دستور اور روایات مرتب کر چکے ہیں جنہیں یہ ''اصولِ سنت'' کہتے ہیں۔ اِس مضمون کے کچھ مخصوص علماء ہیں جنہیں کسی وقت ہم ''علمائے سنت'' کہتے ہیں تو کسی وقت ''علمائے عقیدہ'' تو کسی وقت ''متکلمینِ اسلام''۔ ''امتِ اسلام'' چونکہ محض کوئی فلسفیوں کا گروہ نہیں بلکہ یہ ایک صحیح معنیٰ کا سماج ہے جس میں عورتیں بچے جوان بوڑھے، امیر غریب،

مزدور کسان تاجر، نوکر افسر سیاستدان وکیل فوجی، عالم عامی، شہری دیہاتی، ہر طبقے اور ہر صلاحیت کے لوگ آتے ہیں، جو پوری زندگی کو چلاتے ہیں البتہ خدا کی مطلوبہ تصویر پر پورا اترنا ان میں سے ایک ایک اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے... جبکہ ان سب کو اپنی اِس ''مطلوبہ تصویر'' پر حملہ آور کسی 'ازم' سے نمٹنے کے لیے اپنی روزمرہ زندگی کے ہنگامے چھوڑ کر نہیں آنا ہوتا لہٰذا ''علمائے عقیدہ'' ان کے لیے ایک فرضِ کفایہ انجام دیتے ہیں اور پھر کچھ امت کے گبھرو ان کے ساتھ ہو لیتے ہیں جو ایک طرف حملہ آور کو پسپا کرتے ہیں تو دوسری طرف امت کو ایسے ہر نئے وائرس کی بابت ایک عمومی آگہی دیتے ہیں... اور جب تک امت کا ایک عام شخص ''فرقوں اور تہذیبوں'' کا بھیدی (specialist) نہیں ہو جاتا تب تک وہ اس ''عمومی آگہی'' (general awareness) پر ہی سہارا کرتا ہے اگرچہ کوئی حملہ آور کتنا ہی ورغلائے کہ تم اپنے اس ناپختہ علم کے ساتھ بھی بس میری 'دلیل' تو چیک کرو۔ (وہ حضرات جو ہمارے بیان کردہ اِس مبحث میں ہمارے ساتھ الجھیں گے وہ سب، یا ان میں سے اکثر 'امت'' کے معنی بلکہ وجود کو ماننے میں ہی امت کی مین سٹریم سے اختلاف رکھتے ہوں گے)۔

المختصر، اسلامی حقیقت پر حملہ آور ایک فکر یا رجحان کے مقابلے پر ''سنت و جماعت'' کا دفاع دو محوروں پر ہوتا ہے: ایک اس کا بیرونی محور یعنی حملہ آور کو جواب۔ اس کو جدل یا مناظرہ کہا جاتا ہے جو کہ حق ہے اور عموماً کسی خاص نوبت یا ضرورت کو پہنچ کر ہوتا ہے۔ دوسرا، اندرونی محور یعنی اہل اسلام کو اس کی بابت دی جانے والی آگہی (awareness)۔ دوسرا اہم تر اور واجب تر ہے۔ ہر دو میں آپ کا علمی سہارا ''سنت و جماعت'' کے عالم ہوتے ہیں۔ اور ہر دو میں ''سنت و جماعت'' کے علماء کو امت سے دست و بازو درکار ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے غیر علماء بھی ہوں گے جو علماء سے دلیلیں اٹھا اٹھا ایک فتنہ کو جواب دے رہے ہوں گے (بیرونی محاذ)۔ اور ایسے غیر علماء بھی جو اس فتنہ پر علماء کی تقریرات سے اہل اسلام کو باخبر کر رہے ہوں گے (اندرونی محاذ)۔ ہماری ان تحریرات کا تعلق ''لبرلزم'' کے موضوع پر اس دوسرے محور سے ہے۔ یعنی اسلام کو اپنا عقیدہ مان رکھنے والوں کے لیے ''لبرل'' فتنے پر کچھ ضروری آگہی۔ اس کے لیے یہ دیکھنا کافی ہوتا ہے کہ آپ کے دور کے علمائے سنت و جماعت، شرق تا غرب، امت پر حملہ آور ایک فتنے کو کس طرح دیکھتے ہیں۔

لبرل ازم کے مسلم علمبرداروں کے طرز فکر اور طریقِ واردات کی تفہیم (بصورت ڈائیلاگ)

اسلام کے حلال وحرام عام آدمی کے کان میں ''مولوی'' کے خطبہ و وعظ سے پڑے ہوتے ہیں۔ صحیح و غلط کی پہچان اور فرض ومباح کا تصور اس کو مساجد کے درس و بیان سے دستیاب ہوا ہوتا ہے۔ (آج جس 'تحقیق' کے پردے میں علماء پر عدم اعتماد کی دعوت یہاں کے عام مسلمان کو وقت کا 'جدت پسند' بیانیہ دینے لگا ہے، وہ کیسا ایک ہولناک خلا یہاں لبرلزم وغیرہ بلاؤں کی پیش قدمی کے لیے پیدا کر رہی ہے، اس پر کسی اور فرصت میں بات کریں گے)۔

لبرل کے ساتھ مکالمہ عموماً اِس مضمون کی کسی بحث سے شروع ہوتا ہے:

عام مسلمان: بھائی! عالم سے یہ مسئلہ اِسی طرح سنتے آئے ہیں۔

لبرل: ارے، مولوی کیا نہیں کہتے! عالم تھوڑی ہوتے ہیں یہ۔

یہاں؛ وقت کے کچھ جید علماء کے نام لبرل کو پیش کیے جاتے ہیں۔

عام مسلمان: یہ سب نامور علماء اِس پر یہی کہتے ہیں۔ بلکہ ہر مسلک کا عالم۔ اختلافی مسئلوں میں یہ کم از کم نہیں آتا۔

لبرل: پھر بھی، علماء ہیں۔ صحابہ تو نہیں!

(صحابہؓ کے ساتھ فرطِ عقیدت!؟)

یہاں؛ اسے صحابہؓ کا قول پیش کر دیا جاتا ہے۔

عام مسلمان: عالم سے پوچھ آیا۔ خود صحابہؓ سے اس مسئلہ میں یہی منقول ہے۔ لیجیے، ملاحظہ فرمائیے۔

لبرل: صحابہؓ قابل احترام ہیں۔ لیکن حجت تھوڑی ہیں! معصوم تو نہیں تھے نا صحابہؓ! آپ تو یوں حوالے دے رہے ہیں جیسے کوئی حدیث ہوتی ہے! (ایک بار پھر آپ کو لگا، صاحب اسلام سے مخلص ہیں اور حدیث کی بڑی قدر کرتے ہیں!)

یہاں اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث پیش کر دی جاتی ہے۔

عام مسلمان: دیکھیے، حدیث مل گئی۔ یہ رہی، پڑھ لیجئے۔ اس میں بھی یہی ہے۔

لبرل: لیکن یہ حدیث بخاری کی نہیں ہے۔قوی ہوتی تو بخاری میں آنے سے بھلا رہتی!؟معلوم ہوتا ہے سند میں کمزوری ہے۔

عام مسلمان: بخاری میں بھی یہ حدیث مل گئی۔

لبرل: لیکن بخاری کی ساری حدیثیں ٹھیک تو نہیں ہیں نا۔کئی ساری حدیثوں پر محدثین کا بڑا بڑا کلام ملتا ہے۔ بخاریؒ بھی آخر انسان ہی تھے،غلطی ہر کسی سے ہو جاتی ہے۔ بڑا بڑا اختلاف ہوا ہے،آپ کبھی کتابیں پڑھ کر دیکھیں۔

عام مسلمان: مگر اِس حدیث پر کسی محدث نے کلام نہیں کیا۔علم حدیث کے سب رجال نے اس کے صحیح ہونے پر اتفاق کیا ہے۔اور سب فقہاء نے استدلال میں اسے حجت مانا ہے۔اِس پر آپ کو اجماع دکھا دیتے ہیں،اگر آپ اختلاف کی بات کرتے ہیں۔

لبرل: لیکن اجماع حجت تو نہیں ہوتا۔قرآن میں تو یہ حکم نہیں ملتا نا۔

عام مسلمان: چلیے قرآن مجید سے آپ کو یہ ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ رہی آیت۔

لبرل: لیکن آیت سے یہ بات صریح طور پر تو نہیں نکلتی۔ کچھ اور بھی مطلب ہو سکتا ہے اس آیت کا۔تفاسیر پڑھیں، بڑی بڑی آراء ہیں۔

عام مسلمان: سب نے اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے حتیٰ کہ جدت پسندوں کے ائمہ نے بھی۔کوئی اور احتمال ہی نہیں ہے اِس معنیٰ کے سوا۔

(غرض اس کے سب اشکالات دور کر دیے۔عربی کے سب اوزار لا حاضر کیے گئے؛اور آیت کا 'کوئی اور معنیٰ' ہونے کے تمام امکانات رفع کر دیے گئے)۔

لبرل: لیکن یہ حکم اُس وقت کے لیے مناسب تھا آج کے لیے نہیں۔اعتبار کلی مقاصد کا رکھا جاتا ہے؛جزوی صورتوں کا نہیں۔آپ نے شاطبی کی الموافقات پڑھی ہے؟

(یہاں اس کو ''مقاصدِ شریعت'' سے بھی یہی بات ثابت کر کے دے دی جاتی ہے اور یہ واضح کر دیا جاتا ہے کہ یہ بات اسلام کے کلیات میں سے ہے؛کوئی جزوی مسئلہ نہیں)۔

عام مسلمان: بھائی دیکھو!اگر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات ہے تو وہ تو ہے یہی۔ دینِ

اسلام کے جو جو مصادر ہیں ان میں یہ مسئلہ عین اِسی طرح ہے۔آگے بات کرو۔

''تقیہ'' کے اتنے پرت اترنے کے بعد کہیں جا کر...اندر کا لبرل نکلتا ہے (کسمساتا، بادلِ نخواستہ۔ورنہ ابھی تک اپنی مسلمانی پکی تھی اور اسلام کو ردّ کرنے سے متعلق ہر بار بات 'آئی، گئی'!)

لبرل: ہو گی وہ اللہ یا رسول کی بات، جس کا ویسے مَیں احترام کرتا ہوں۔لیکن لوگوں کو پابند کسی بات کا نہیں کیا جا سکتا۔آزادی ہر انسان کا حق ہے۔

(یہاں چونکہ لبرل نے وہ ماسک اتار ڈالا، جو مسلم معاشرہ میں 'روزمرہ آمد و رفت' کے دوران اس کے زیر استعمال رہتا ہے..اور اس کا وہ رخ سامنے آ گیا جو خدائی تنزیل کے اُس سٹیٹس پر ہی سوال اٹھاتا ہے جو انبیاء اور ان کے پیروکاروں کے یہاں مسلَّم مانا گیا...لہٰذا بقیہ مکالمہ میں 'مسلمان' کے ساتھ لفظ 'عام' کا اضافہ شاید ضروری نہیں رہا۔گو ایک ممکنہ غلط فہمی کا ازالہ ہماری آئندہ تحریر میں آئے گا۔مختصراً، رسالتِ محمدی ﷺ اور اس میں وارد احکام کو بائنڈنگ یعنی ''پابندی کا موجب'' ماننے والا ہر شخص ہمارا مسلمان بھائی ہے خواہ وہ لبرل کہلائے یا کچھ اور۔یہاں سیاقِ گفتگو ذرا ایک حقیقی قسم کا لبرل ہے اور وہ کسی بھی ملت سے ہو سکتا ہے)۔

مسلمان: آزادی کا تو ہم نے انکار نہیں کیا میرے بھائی۔لوگوں کو حق بات بتا دو اور پھر آزاد چھوڑ دو؛ ماننا چاہیں تب، نہ ماننا چاہیں تب۔زبردستی تو نہیں کی کسی سے۔ہمارا دین ہی ہمیں ایسی کسی دھونس کی اجازت نہیں دیتا۔اسلام نے ان کو آزادی دے کر ہی یہ چناؤ ان کے آگے رکھا ہے کہ چاہے ''فرماں بردار'' ہو جاؤ اور چاہے ''نافرمان''۔اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا آزادی (لبرٹی) کا کیا مسئلہ اٹھا دیا آپ نے یہاں، کس نے اس پر جھگڑا کیا؟

لبرل: صرف زبردستی نہ کرنا اور لوگوں کو ماننے نہ ماننے کا اختیار دینا ہی آزادی (لبرٹی) ہے؟ ہونہہ!

مسلمان: تو آپ کس آزادی کی بات کر رہے ہیں؟

لبرل: جس میں انسان کی سوچ اور مرضی پر کوئی دباؤ نہ ہو۔ریاستی قوانین کی استثناء کے ساتھ۔یا ایک دوسرے کے لیے ضرر رساں اشیاء کی استثناء کے ساتھ۔بقیہ تمام پابندیوں

سے آزادی۔

مسلمان: آپ کی مراد: انسان کی انسان پر لگائی ہوئی پابندیاں؟ یہ تو ہمارے نزدیک بھی نادرست ہے۔ ہمارے دین نے بہت پہلے یہ گھناؤنا بُت توڑا: وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ ''اور نہ بنائیں ہم آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے ماسوا رب''۔ انسانوں کو یہ آزادی فراہم کرنا تو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ ایک خدائے لاشریک کے سوا یہ کسی کے حکم کے غلام نہ ہوں۔ لِنُخْرِجَ الْعِبَادَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ، إِلَى عِبَادَةِ رَبِّ الْعِبَاد ''تا کہ نکال لائیں ہم بندوں کو بندوں کی بندگی سے، بندوں کے رب کی بندگی کی طرف''۔ یہاں؛ کم از کم بھی یہ شرط ہے کہ بندوں کو کسی بات کا پابند کرنے میں آپ خدا کے دیے ہوئے ایک متعین دائرے سے باہر نہیں نکلیں گے چاہے آپ کوئی بڑی سے بڑی اکثریت یا مقننہ یا کوئی فرماں روا یا کوئی ایمپائر کیوں نہ ہوں۔ انسان کا وہ حق یہاں آپ سے آپ ''خدا کی حد'' ہوتا ہے جسے توڑنا صاف شریعت کو توڑنا۔ اور یہ آزادیوں کا اتنا بڑا دائرہ ہے کہ انسان کے سب حقوق خدا کی اپنی تشریع سے ہی محفوظ ہو جاتے ہیں۔ غرض شریعت یہاں خود اس بات کی ضامن ہو جاتی ہے کہ انسان انسان کی آزادی میں مخل نہ ہو۔

لبرل: نہیں۔ انسان کی انسان پر پابندیاں تو بالکل ٹھیک ہوتی ہیں جب وہ اکثریتِ رائے سے ہوں۔ (ان پابندیوں کی حد کیا ہو، یہ بحث البتہ دینِ لبرلزم کے اپنے فرقوں کے مابین خاصی طویل اور فی الحقیقت لاینحل ہے۔ بس یہ کہہ سکتے ہیں، اکثریت کی خواہشات و شہوات ''قانون'' کا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر معتبر بن جائیں، اس کی ایک وسیع گنجائش تقریباً ہے)۔ پس ''انسانوں کی لگائی ہوئی پابندیوں'' کے تو اصولاً ہم قائل ہیں اور یہ تو آپ پر ٹھونسی جائیں گی۔ میں ان کی بات نہیں کر رہا۔

مسلمان: تو پھر آپ کن پابندیوں سے آزادی کی بات کر رہے ہیں؟

لبرل: ہر قسم کی پابندیوں سے آزادی، سوائے انسان کی اجتماعی (اکثریتی) مرضی کے۔

مسلمان: خواہ وہ پیدا کرنے والے کی عائد کردہ پابندیاں ہوں؟ چلیے صرف آخری آسمانی رسالت کی بات بھی نہیں کرتے۔ خواہ وہ سب ملتوں کے ہاں مسلّم چلی آتی شرم، حیاء، عفت اور اخلاق سے متعلقہ قدریں ہوں جو ہمیشہ انسانوں کے یہاں خدا کی تشریع سے ہی

منسوب چلی آئی ہیں۔ پیدا کرنے والا جہاں پابند کرے، اور وہ بھی روئے زمین کی تمام ملتوں کی شہادت سے، وہاں بھی، آزادی؟

لبرل: دیکھیے آزادی ہر انسان کا حق ہے؛ کوئی قدر اس سے اوپر نہیں۔

مسلمان: کیا آپ آسمانی صحیفوں کو مانتے ہیں؟ ان کی رُو سے بات کر لیں کہ انسان بطور معاشرہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی خصوصاً حیاء وعفت سے متعلقہ قدروں پر مبنی اُس کے حکموں کا پابند ہے یا نہیں؟ یعنی ان کی بنیاد پر معاشرے میں روک ٹوک ہوسکتی ہے یا نہیں؟

لبرل: آزادی خود سب سے بڑی قدر ہے۔ اور یہ آپ اپنی دلیل ہے۔ اس سے اوپر کوئی بات نہیں۔

مسلمان: آزادی، پیدا کرنے والے کے صریح حکم کے آگے بھی؟ اس بات کے داعی ہیں آپ؟

لبرل: کیا کہلوانا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟ میں مذہب کی قدر کرتا ہوں۔ آپ اپنی مرضی سے اس پر عمل پیرا ہیں، بس میں اس بات کا احترام کرتا ہوں۔

مسلمان: اور اگر میں پیدا کرنے والے سے ڈر کر اور اُس کی شان اور مرتبے سے دب کر مذہب پر عمل پیرا ہوں اور ہر پل اُس کے حکم کے آگے اپنی ''مرضی'' کو قربان کروں.. اور اِس خوئے تسلیم کو اپنے سرخرُو ہونے کی بنیاد اور معیار مانوں...؟ بلکہ ایک مذہب کا نام ہی یہ ہو ''اسلام''، یعنی اپنی مرضی سے دستبرداری اور اس کے مقابلے پر خدا کی مرضی کی، جو زمین پر اُس کی رسالت کے ذریعے سے معلوم ہوتی ہے، بلا چوں و چرا پابندی۔ خاص اُس کی منشا کی تعظیم، ساتھ ہمہ وقت اُس کی حمد اور پاکی (جس میں یہ معنیٰ بھی شامل ہے کہ وہ اپنی ہر بات میں ٹھیک اور اُس کا ہر فرمان حق ہے)... اور پل پل اپنے قصور و کم مائیگی کا اعتراف اور اپنے عہدِ بندگی اور اظہارِ غلامی کا اِعادہ۔

لبرل: یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے جس میں مَیں نہیں پڑنا چاہتا (پاکستانی پبلک میں لبرلسٹ تحریک کے لیے ’فی الحال‘ ریڈ لائن)، میں اس کی قدر بہرحال اس حوالے سے کرتا ہوں کہ بطورِ انسان یہ آپ کا فیصلہ ہے۔ ایک سچا لبرل ہوں، کسی مذہب کے خلاف تعصب نہیں رکھتا۔

مسلمان: یعنی میرا یہ فیصلہ خاص اس حوالے سے قابل قدر ہے کہ وہ میری مرضی ہے؛ اِس حوالے سے نہیں کہ وہ خالقِ کائنات کی عبادت ہے اور اُس کے حکم کی پابندی!

لبرل: ہاں ''پابندی'' کے حوالے سے نہیں بلکہ ''آزادی'' کے حوالے سے۔

یعنی مومن کے اِس فیصلے میں بھی جتنا سا 'انسانی مرضی' کو دخل ہے اُسی کے بقدر یہ ایک لبرلسٹ کے لیے قابل احترام ہے۔ (گو جتنی سی اس میں 'انسانی مرضی' کی نفی ہے اُس کے بقدر یہ ایک 'حقیقی' لبرلسٹ کی نظر میں قابل اعتراض بھی ہے۔ لیکن یہ دوسری بات فی الحال پاکستانی معاشرے میں زبان پر لانے کی نہیں! لہٰذا پہلے حوالے سے؛ خدا کا فرماں بردار ہونے سے متعلق آپ کے فیصلے کا جب اُس نے احترام کیا تو کچھ ایسی غلط بیانی نہ کی۔ بس ایک غلط فہمی میں آپ کو رکھا، جسے شاید وہ 'آئندہ' کسی مرحلے میں دُور کرے! یہ بہرحال طے ہے کہ اُس کے عقیدے میں مطلق قدر(absolute value) ''انسانی مرضی''(human will) ہے جس سے وہ اشیاء کی قدروں کو ماپتا ہے۔ یہی اس کا معبود)۔ یہاں بھی؛ اصل میں وہ اپنے معبود انسانی مرضی کو سیلوٹ کر گیا ہے۔ ساتھ میں آپ کے مذہب کی تعظیم ہو گئی! ایک گونا، اِس میں وہ سچا بھی رہا: اس نے اپنے معبود انسانی مرضی(human will) کو خاص اپنی منشا سے خدا کے حکم کے آگے جھکے ہوئے دیکھا۔ اب معبود سے جواب پُرسی ہونے سے رہی خواہ وہ جتنا بھی 'سمجھ سے بالاتر' کام کرے! لہٰذا یہاں خاموش ہونا بنتا تو ہے۔ کم از کم بھی، یہاں خاموشی لبرل عقیدہ کے منافی نہیں ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس سے آگے ایتھزم(etheism) وغیرہ کی حدود شروع ہو جاتی ہیں جو سب لبرلز کے جانے کی نہیں۔ لہٰذا وہ ایریا ایتھسٹک لبرلز (atheistic liberals) یا اگناسٹس(agnosts) وغیرہ ڈیل کریں گے۔ اور یہ ہم مانتے ہیں کہ بہت سے لبرل صدقِ دل سے یہاں رک جاتے ہیں۔ البتہ باقی ماندہ کام ان کے 'بھائی' کرتے ہیں۔

مسلمان: تو پھر خدا کے ایک نافرمان کا خدا کے حکم سے سرتابی کا فیصلہ بھی اتنا ہی قابل قدر ہوا؟

لبرل: میں نے کہا نا آزادی سب سے بڑی قدر ہے۔

(جاری ہے)

عالم اسلام مدیر

شام کی ’شامِ غم‘ اور
زوالِ امت کے ذمہ دار۔ ایران اور سعودی عرب

شام کے المیے پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ہم سب کے دیکھتے، کھلے عام شام میں لوگوں کا قتل عام ہو رہا ہے، کچھ جان بچانے کے لیے ملک سے بھاگتے ہیں، کچھ سمندر میں ڈوبتے ہیں، کچھ دوسرے ممالک میں امن اور روٹی کی بھیک مانگتے ہیں۔ غوطہ کی طرح جن کو محصور کر کے مارا جاتا ہے ان کی کہانی مزید دردناک ہے۔ اردگرد گھیرا تنگ، اوپر سے بمباری، شہر اور گھر سے نکل نہیں سکتے، نہ کھانے کو روٹی، نہ دوا، نہ علاج۔ نانِ جویں کے چند ٹکڑوں کے عوض عزتیں لٹتی ہیں اور بچے والدین کی گودوں میں تڑپتے ہیں.... الامان، الحفیظ۔

اور کس کے آگے روئیں؟ کس سے جا کر شکایت کریں؟ یہ زخم ہمارے اپنوں کے دیے ہوئے ہیں۔ شام کی کہانی کس سے مخفی ہے؟ ۳ فیصد نصَیری (علویوں کا ایک انتہا پسند گروہ جسے اکثر شیعہ بھی گمراہ کہتے ہیں) گروہ پچھلے پچاس سال سے ۷۴ فیصد اہل سنت شامیوں کا خون چوس رہا ہے۔ چند سال پیشتر جب عرب ممالک میں تحریک مزاحمت کی ہوا چلی تو شامی لوگ بھی آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس ۳ فیصد اقلیتی حکمران ٹولے کے اقتدار کو بچانے کے لیے ایران اس کی حمایت میں میدان میں کود پڑا.... اور یہ پہلا موقع نہیں کہ ایران نے ایسی حرکت کی ہو۔ موجودہ ایران وہ ایران نہیں جو امام خمینی کا ایران تھا جس میں ’مرگ بر امریکا‘ اور ’مرگ بر شیطان بزرگ‘ کے نعرے گونجتے تھے۔ یہ موجودہ ایران ہے جس نے ہمسایہ ملکوں اور مشرق وسطیٰ میں اپنا شیعی انقلاب برآمد کرنے کے لیے خاموشی سے امریکہ کے ساتھ ساز باز کر لی ہے۔ پہلے عراق کو امریکہ سے پٹوایا، یمن میں شیعہ اقلیت کو اسلحہ، تربیت ریال اور افرادی قوت دے کر حکومت پر قبضہ کروایا اور اس طرح سعودی عرب کی سرحد پر پہنچ کر اس کی سیکورٹی کو خطرے میں ڈال دیا۔

شام میں ایرانی مداخلت کو بے اثر کرنے کے لیے سعودی عرب نے شامی حکومت کے

مخالفین کو مدد دینی شروع کردی۔ پھر سعودیوں کی مدد کے لیے امریکہ و یورپ شام کی جنگ میں کود پڑے تو ایران روس کو اپنی حمایت میں لے آیا۔ امریکہ ترکی میں اردگان حکومت کا تختہ الٹنے میں ناکام ہوا تو اس نے ترکی کی عراق اور شام سے ملنے والی سرحد پر کردوں سے ترکی پر دہشت گردانہ حملہ شروع کرادیے۔ یوں ترکی بھی شام کی جنگ میں کود پڑا۔ ذرا تصور کیجیے دنیا کے کتنے ملک شام میں لڑ رہے ہیں؟ اور برباد کون ہو رہا ہے شام؟ مر کون رہے ہیں؟ شامی! تو امریکہ اور روس کو اس کی پروا کیوں ہو؟ جب مسلمان خود ہی آپس میں لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو پرائے کیوں فکرمند ہوں؟ اس چنگاری کو شعلوں میں بدلنے والا کون ہے؟ ایران۔ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ شیعیت کا پھیلاؤ اور شیعوں کو اقتدار دلانا۔ لبنان میں ان کی حزب اللہ پہلے سے قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ بحرین میں وہ مداخلت کر رہا ہے۔ سعودی عرب کے مشرقی علاقوں میں شیعہ عناصر کو بھی وہ مشتعل اور منظم کر رہا ہے۔ عراق میں صدام کو پھانسی لگوا کر امریکی حمایت سے وہ شیعوں کو اقتدار میں لا چکا ہے اور شام اور یمن میں وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اسلام دشمن امریکہ و یورپ تو یہی چاہتے ہیں کہ مسلمان آپس میں لڑتے اور مرتے رہیں، لڑ لڑ کر کمزور ہوتے رہیں اور اسے سازشوں کا موقع ملتا رہے۔ ایران اہل مغرب کے ان ارمانوں کو پورا کر رہا ہے۔

سعودی عرب: ایران کے کردار کی گھمبیرتا اپنی جگہ، سعودی حکمرانوں نے امت مسلمہ کو ان سے کم نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ حکمران شروع سے ہی مغرب کے غلام رہے ہیں۔ انہیں خلافت کی بحالی کا موقع ملا تھا لیکن انہوں نے عمداً اسے اہل مغرب کی خوشنودی اور حمایت کے لیے ضائع کردیا۔ ان کی پالیسیاں ہمیشہ مغرب پرستانہ رہیں، سوائے شاہ فیصل کے استثناء کے، جنہیں مغرب نے شہید کرا دیا۔ اسلامی کانفرنس تنظیم (OIC) کو اس نے مغرب کے مطالبے پر سرد خانے میں منجمد کرا رکھا ہے تاکہ امت زخموں سے نڈھال تڑپتی رہے اور اسے کہیں سے دوا تو دور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بھی نہ مل سکے۔

امریکی منصوبے کے تحت مسلم ملکوں کا فوجی اتحاد بنانے کی کوششیں بھی جاری ہیں تاکہ امریکہ و یورپ نے عالم اسلام کے خلاف دہشت گردی کی جو جنگ چھیڑ رکھی ہے، اس کے لیے اسے مسلم ممالک سے لڑنے کے لیے سپاہی مل سکیں تاکہ کسی امریکی سپاہی کی جان خطرے

میں نہ ڈالنی پڑے۔ اس مجوزہ فوجی اتحاد کی قیادت کے لیے اس پاکستانی جنرل سے زیادہ موزوں کون ہوسکتا تھا جس نے امریکیوں کے لیے پاکستان میں یہ جنگ برسوں لڑی اور استعمار کے مقاصد پورے کیے۔

اب تک سعودی حکمران امریکی غلامی تو کرتے تھے لیکن اپنی تہذیب وتمدن پر اصرار بھی ساتھ جاری رہا۔ اب جو حکومت آئی ہے وہ مغرب کی مکمل غلامی کا ایجنڈا لے کر آئی ہے اور سعودی معاشرے کو مغرب پرستی کی راہ پر چلانا اپنا فرضِ منصبی سمجھتی ہے۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ کتنے بے عقل، کم ظرف اور بدنصیب ہیں یہ سعودی حکمران جنہیں پونے دو ارب مسلمانوں کے ۵۷ ممالک کی سیادت میسر تھی اور وہ اسے ٹھکرا کر امریکہ ویورپ کی چاکری پر خوش ہیں۔ فکری غلامی کا جادو جب سر چڑھ کر بولے تو ایسے ہی عجوبے وجود میں آتے ہیں۔

پاکستان اور ترکی

ہم دوسروں کو کیا کہیں خود ہمارے وطن عزیز کی حالت یہ ہے کہ اتنا کچھ سہہ لینے اور دیکھ لینے کے باوجود مغرب کی غلامی کا خمار ہم پر سے اتر ہی نہیں رہا۔ آج بھی یہ حالت ہے کہ ہماری حکومت نے بڑی جدوجہد سے علماء سے یہ فتویٰ لیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے مغرب کے دباؤ میں آ کر کیا ہے وہ عین اسلامی ہے۔ آج بھی مغرب کے خلاف بولنے والے اٹھا لیے جاتے ہیں اور عقوبت خانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ آج بھی امریکہ ویورپ کے لیے برادر ملک افغانستان کے مجاہدین کو کچلنے کی خاطر اسلحہ، بارود اور دیگر سامان پاکستان کی بندرگاہوں اور سڑکوں سے گزر رہا ہے۔

لے دے کر نگاہیں ترکی کی طرف اٹھتی ہیں۔ کاش کوئی ایسی صورت بن جائے کہ OIC مغرب کے غلام سعودی حکمرانوں کے شکنجے سے نکل آئے اور اردگان صاحب اس کو موثر طور پر اسلام کے حق میں اور استعمار کی مزاحمت کے لیے استعمال کر سکیں۔

دریچے

نقیبِ سحر

پڑھتا جا شرماتا جا

ا۔ تنظیم اسلامی استحکام پاکستان کانفرنسوں کا ایک سلسلہ مختلف شہروں میں منعقد کر رہی ہے۔ تنظیم اساتذہ پاکستان ہر سال استحکام پاکستان کانفرنس برپا کرتی ہے۔ جماعۃ الدعوۃ اور دفاعِ پاکستان کونسل وقتاً فوقتاً دفاعِ پاکستان کانفرنسیں منعقد کرتی رہتی ہیں جو ایک لحاظ سے استحکام پاکستان کانفرنسیں ہی ہوتی ہیں۔ باقی سیاسی، غیر سیاسی اور دینی جماعتیں بھی حسب توفیق اور حسب ضرورت اسی نوعیت کی کانفرنسیں منعقد کرتی رہتی ہیں۔ ان کانفرنسوں کے باوجود پاکستان ہے کہ عدم استحکام کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مذکورہ سب جماعتیں استحکام پاکستان کانفرنسوں کو چھوڑ کا استحکام پاکستان کو فروغ دینے والے انسانوں کی تعمیر کا کام شروع کر دیں۔ ایک 'باخبر' سے اس کا ذکر کیا تو ان کا کہنا تھا کہ اس طرح تو استحکام پاکستان کی منزل شاید حاصل ہو جائے گی اور پھر استحکام پاکستان کانفرنسیں منعقد کرنے کا جواز ختم ہو جائے گا۔ اسی ڈر سے مذکورہ جماعتیں انسان سازی کے کام سے اجتناب ہی میں اپنی بقا سمجھتی ہیں۔

۲۔ اتحاد بین المسلمین اس وقت سب سے بلند آہنگ نعرہ ہے۔ تمام دینی گروہ، اسلامی جماعتیں اور تمام مذہبی مسالک اس کے داعی بن گئے ہیں۔ اہل حدیث جب اتحاد بین المسلمین کا نعرہ لگاتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سب مسلمان اہل حدیث مسلک اختیار فرمالیں۔ اہل تشیع جب دعوتِ اتحاد دیتے ہیں تو منشا ان کا یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ شیعہ مسلک کو قبول کر لیں۔ تبلیغی بھائی جب اتحاد کا درس دیتے ہیں تو ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ سب لوگ سہ روزہ، دس روزہ، چالیس روزہ وغیرہ لگائیں اور سالانہ تبلیغی اجتماع رائے ونڈ میں شرکت کریں۔ تحریکی بھائی تو ویسے ہی مسلک سے بالاتر ہیں اور دعوت ان کی یہ ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لیے تحریک میں شامل ہو جائیں۔ اہل سنت والجماعت عرف بریلوی حضرات کے مطابق محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.... کا تقاضا یہ ہے کہ سب لوگ صلوۃ وسلام کے جھنڈے تلے

جمع ہو جائیں۔ نتیجہ ان سب مساعی کا یہ ہے کہ مسلکی انتشار ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ امت مسلمہ پارہ پارہ ہو رہی ہے اور اتحاد کے داعیوں کا حلوہ مانڈہ بھی چل رہا ہے۔ بس اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی منشا کے مطابق اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامنے کا داعیہ کہیں نظر نہیں آتا۔

۳۔ محکمہ تعلیم حکومت پنجاب اور جنگ کلچرل ونگ کے زیر اہتمام "ایک ملک، ایک قوم اور ایک سوچ" کے عنوان کے تحت سیمینار منعقد کیا گیا جس کا مقصد ایک نصاب، ایک کتاب اور یکساں نظامِ تعلیم کا حصول تھا۔ مقصد بڑا نیک لیکن قوم کا عمل بالکل الٹ ہے۔ اٹھارہویں دستوی ترمیم کے تحت نصاب، کتاب اور امتحان جو پہلے وفاقی موضوع تھا اب صوبوں کو دے دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ ملک میں ہر صوبے کا علیحدہ نصابی ادارہ بن گیا حتیٰ کہ وفاقی سطح پر بھی نصاب وکتاب کے دو علیحدہ ادارے وجود میں آ گئے۔ گیریژن اور آرمی سکولوں کا علیحدہ نصاب ہے۔ پرائیویٹ سکولوں کی ہر چین (Chain) نے علیحدہ علیحدہ نصاب اختیار کر رکھا ہے۔ کئی طرح کے بیرونی نصابات ملک میں رائج ہیں۔ دینی مدارس کے ہر مسلکی گروہ کا اپنا اپنا مسلکی نصاب ہے۔ ایک ملک، ایک قوم اور ایک سوچ کے تصور کو اگر سامنے رکھا جائے تو ملک میں درجنوں قومیں اور سیکڑوں سوچیں پروان چڑھائی جا رہی ہیں۔ اس صورتِ حال میں اتحاد، اتفاق اور استحکام ایک ڈراؤنا خواب نہ ہو تو اور کیا ہو؟

۴۔ اچھا ہوا کہ ایک محروم اقتدار صوبے سے چیئرمین سینٹ منتخب ہو گیا لیکن یہ انتخاب جس سیاسی یا غیر سیاسی عمل کے ذریعے سے ہوا کیا وہ بھی قابل تعریف ہے؟ عمران خان کو اپنا موقف چھوڑ کر جناب زرداری سے ہاتھ ملانا پڑا۔ آزاد کیے گئے اراکین سینیٹ فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گئے۔ سیاسی جماعتیں جو سیاسی عمل کا لازمی حصہ ہوتی ہیں بے اثر ہو گئیں بلکہ مجبور کر دی گئیں۔ نادیدہ قوتوں کا تکرار شدت اختیار کر گیا۔ سیاسی انتشار میں اضافہ ہوا، سیاسی تو تکار بڑھی اور بقول شخصے "وہ" پھر جیت گئے جن کی جیت نوشتۂ دیوار ہوتی ہے اور ایک دفعہ پھر کنٹرولڈ جمہوریت کی قومی ضرورت آشکارا ہوئی۔ ہے نہ جمہوری انتقام کی خوبصورت مثال؟

۵۔ ہزاروں، لاکھوں لوگ ہر روز عدالتوں میں خوار ہوتے ہیں۔ وہ مقدمے جن کا فیصلہ گھنٹوں میں ممکن ہے وہ مہینوں بلکہ سالوں التوا میں رہتے ہیں۔ کالا کوٹ انصاف کی راہ

میں دیوارِ چین بن گیا ہے۔ عدل وانصاف کے ایوان ظلم وتعدی کے نشان بن چکے ہیں۔ لاکھوں مقدمات زیر التوا ہیں اور منصف چین کی نیند سوتے ہیں۔ مظلوموں کی آہ وبکاء آسمانوں کو چھو رہی ہے اور بابا رحمتے کارِ انصاف وعدل کو ایک طرف رکھتے ہوئے کارِ انتظام سرانجام دینے کے لیے ہسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں سرگرداں ہے۔ معاشرہ ظلم وجور سے بھر چکا ہے اور منصف بس نعروں تک محدود ہے۔

۶۔ انگریزوں کے دورِ حکومت سے یہ طریقہ چلا آرہا تھا کہ وقفے وقفے سے تحصیل دار مختلف دیہاتوں کا دورہ کرتا۔ دورے سے پہلے پٹواری صاحب اس گاؤں کے فوت ہوجانے والوں کے ورثاء کے نام وراثت کے انتقال تیار رکھتا۔ گاؤں کے لوگوں کے جلسہ عام میں مرحومین اور ان کے ورثا کا اعلان ہوتا اور نمبر دار کی تصدیق سے وراثت کے انتقالات کنفرم کردیئے جاتے۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض ہوتا تو موقع پر ہی اس کا فیصلہ ہوجاتا۔ اس طرح بغیر کسی فیس، رشوت اور سفارش کے زمین کی وراثت کے انتقال انجام پذیر ہوتے۔ کئی دہائیوں تک یہ پریکٹس جاری رہی۔ پہلے تحصیل داروں کے دورے کم ہوئے، پھر ختم ہوگئے لیکن وراثت کے انتقالات بغیر کسی روکاوٹ کے ہوتے رہے۔ اب جناب شہباز شریف کی حکومت نے عوام کو ''پٹواری'' کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے زمینوں کی کمپیوٹرائزیشن کرائی اور وراثت کے انتقالات میں مزید سہولت دینے کی خاطر یہ عمل جاری کرایا کہ پہلے فوت ہونے والے کے فوت ہونے کا ثبوت مہیا کیا جائے۔ اس کے لیے طریقہ کار یہ وضع ہوا کہ پہلے فوت ہونے والے کے فوت ہونے کا اخبار میں اشتہار دیا جائے۔ سات دن تک انتظار کیا جائے تا کہ اگر متوفی کے فوت ہونے کے خلاف کسی کو اعتراض ہو تو وہ آجائے۔ عدم اعتراض کی صورت میں وارثان درخواست لے کر اور اخبار کی کٹنگ کے ساتھ اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں حاضر ہوں۔ اسسٹنٹ کمشنر درخواست کو یونین کونسل کے سیکرٹری کے پاس بھیجے گا۔ یونین کونسل کا سیکرٹری متوفی کے فوت ہونے کی رپورٹ جناب اے سی صاحب کو بھیجے گا۔ اے سی صاحب درخواست گزار کو تحصیل دار کے پاس بھیجے گا جہاں درخواست گزار گاؤں کے دو معززین کو متوفی کا جنازہ پڑھانے والے مولوی صاحب کے ساتھ بطور گواہ تحصیل دار کے پاس حاضر ہوگا۔ تحصیل دار شنوائی کے بعد درخواست گزار وارثان کو جناب اے سی صاحب کے

پاس بھجوائے گا جہاں اگر اے سی صاحب متوفی کے فوت ہونے پر مطمئن ہو گئے تو درخواست گزاران کو سیکرٹری یونین کونسل کے پاس بھیجے گا جو مہربانی کرتے ہوئے وفات کا سرٹیفکیٹ جاری کر دے گا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری ہونے کے بعد وراثت کے انتقال کا عمل شروع ہوگا جس کا آغاز پھر اخبار میں اشتہار سے ہوگا اور چلتے چلتے کہیں دو ہفتوں بعد اور کئی چکروں کے نتیجے میں کمپیوٹر سیکشن کو تحصیل دار وراثت کے انتقال کا حکم جاری فرمائیں گے۔ اگر معاملات اپنی فطری رفتار سے چلتے رہیں اور کہیں بھی رشوت یا سفارش کی ضرورت نہ پڑے تو تقریباً ایک ماہ میں اور اندازاً پانچ ہزار روپے کے خرچ کے بعد وراثت کے انتقال کا یہ باسہولت اور کرپشن فری کام اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ہاں اگر درخواست گزاران زحمت سے بچنا چاہیں تو کسی ایجنٹ کو پکڑ لیں اُسے دس بیس ہزار روپے فیس دیں تو چند دنوں میں یہ سارا کام ہو جائے گا کیونکہ ایجنٹ حضرات تحصیل داروں اور اسسٹنٹ کمشنروں کے اپنے مقرر کردہ ایجنٹ ہوتے ہیں۔

ہے نہ باسہولت، کرپشن فری اور گڈ گورننس کی شاندار مثال جس سے اب پنجاب کے دیہاتوں کے غریب کاشتکار مستفید ہو رہے ہیں۔

بقیہ: 'پیغام پاکستان' - حقیقت کیا ہے؟

اس لیے ہم پچھلے ماہ البرہان میں پروفیسر طارق بٹ صاحب کی دی گئی اس رائے سے

اتفاق کرتے ہیں کہ علماء کرام اور اسلامی دانشوروں نے جو رائے دی ہے وہ آدھا سچ ہے اور باقی آدھے سچ پر انہوں نے غور ہی نہیں کیا؟ کیونکہ حکومت نے انہیں اس پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ملازمین نے حکومت کا یک طرفہ موقف خالص فقہی وقانونی انداز میں ان کے سامنے رکھا اور اس پر ان سے فتویٰ لے لیا۔ اس صورت حال کا جو دوسرا پہلو تھا، علماء کرام نے اس پر غور ہی نہیں کیا۔ یا کیا بھی ہوگا تو خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسا فہمِ دین ہے اور یہ دین کی کیسی تعبیر ہے؟